ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

اگست 2006

قیمت : -/10 روپے

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
محکمہ اعلیٰ تعلیم، وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

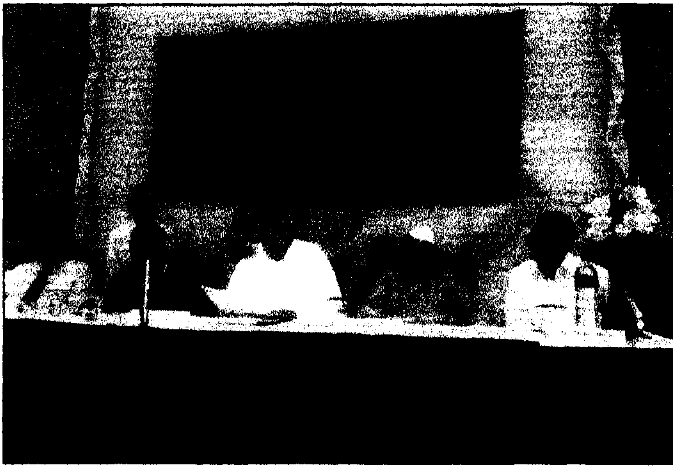

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے بھوپال ریجنل سینٹر کی جانب سے 29 اپریل 2006 کو بمقام 12، احمد آباد پیلیس روڈ، کوہ فضا بھوپال ایک روزہ سیمینار بعنوان "مدھیہ پردیش اور چھتیس گڑھ میں اردو ذریعۂ تعلیم اور مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے امکانات" منعقد کیا گیا۔ اس موقعے پر لی گئی تصویر میں دائیں سے ڈاکٹر محمد احسن (ریجنل ڈائرکٹر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، بھوپال) جناب عزیز قریشی (سابق رکن پارلیمان) عالی جناب بلرام جاکھڑ (گورنر مدھیہ پردیش)، پروفیسر اے. ایم. پٹھان (وائس چانسلر، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد) اور پروفیسر کے. آر. اقبال احمد (ڈائرکٹر شعبۂ تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی)۔

چنئی کے راج بھون میں بزم ادب کرشناگری کے زیر اہتمام پہلی بار مشاعرہ ہوا جس کی صدارت تامل ناڈو کے گورنر عالی جناب سردار سرجیت سنگھ برنالا نے کی۔ اس موقعے پر لی گئی ایک یادگار تصویر میں سمن اگروال، گیان چند سرماگیہ، انیس ابراہیم، حامد باقری، اصغر ویلوری، مختار بدری، عالی جناب سرجیت سنگھ برنالا، جمیل بناری، ڈاکٹر سجاد حسین، سید فاضل حسین پرویز مدیر "گواہ" حیدرآباد، شہزادہ پرویز اور منیر رشیدی۔

ماہ نامہ

اردو دنیا نئی دہلی

جلد۔8، شمارہ۔8 اگست 2006

مدیر: ڈاکٹر آر. کے. بھٹ

معاون مدیر: ڈاکٹر فیروز عالم

ناشر اور طابع:
پرنسپل پبلی کیشن آفیسر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
وزارت ترقی انسانی وسائل، محکمہ ثانوی و اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

کمپوزنگ: اسد نیاز، بہلول احمد
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

مطبع: ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا،
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

قیمت -/10 روپے، سالانہ -/100 روپے

ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں۔

صدر دفتر:
ویسٹ بلاک۔1، ونگ-6
آر۔کے۔پورم، نئی دہلی- 110 066
فون: 26103381, 26103938
فیکس: 26179657، 26108159
ویب سائٹ:
http://www.urducouncil.nic.in
email: urducoun@ndf.vsnl.net.in

شعبۂ فروخت:
ویسٹ بلاک-8، ونگ-7،
آر. کے. پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746, 26169416

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس،
بلاک نمبر 1-5، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002
فون: 24415194 - 040

اس شمارے میں

آپ کی بات 2

ہماری بات 5

روبرو

- عابد سہیل سے گفتگو .... ممتاز عالم 6

زبان اور تعلیم

- فن ترجمہ نگاری: حدود اور امکانات .... سید احسان الرحمٰن 11
- کیرالا میں اردو تعلیم .... کے. پی. شمس الدین 14
- اردو معلموں کی تربیت کا مسئلہ .... عبدالودود انصاری 18

اقتصادیات

- خواتین اور ترقی کی رفتار .... ہرویر سنگھ 19

سائنس

- جاپانی سوپر سونک طیارہ: آواز سے دوگنی رفتار .... نخبے اُدے ورما 22
- پانی اور ہمارا جسم .... جمال نصرت 23

ماحولیات

- آب و ہوا کے نمونے میں تبدیلی اور اثرات .... اقبال محی الدین 24

طب

- گردوں کی حفاظت .... حکیم اشہر قدیر 28

ثقافت

- کشمیر— محبتوں کی سرزمین .... کمال احمد صدیقی 30

ادب

- پرمیشر سنگھ (افسانہ) .... احمد ندیم قاسمی 32
- فسادات اور اردو کا افسانوی ادب .... زبیر رضوی 40
- مقبول عام ادب .... اظہار اثر 44

ہماری مطبوعات سے

- شعر کی تعریف میں ("بحر الفصاحت" سے ماخوذ) .... حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری 46
- 1857 کی بغاوت میں وہابیوں کا حصہ ("انقلاب 1857" سے ماخوذ) .... کے. ایم. اشرف 50

طلبہ کے لیے

- لائبریری سائنس میں کیریئر .... سنجیو کمار 55

اردو خبرنامہ .... ادارہ 57

تبصرہ و تعارف .... کتابوں پر تبصرے 68

بچوں کا گوشہ

- گوپال کرشن گوکھلے ("بے زبانوں کی دنیا" سے ماخوذ) .... حیدر بیابانی 74

آپ کی بات

■ **حبیب الرحمٰن جلالی، حریم، ملت روڈ، دودھپور، سول لائنس، علی گڑھ۔**

''اردو دنیا'' کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ ہر مہینے کے اواخر میں نئے شمارے کا شدت سے انتظار رہتا ہے۔ اس کے مشمولات میں اتنی رنگارنگی، بوقلمونی اور معلومات ہوتی ہیں کہ ہر طرح کے قارئین کی تسکین کا ساماں موجود ہوتا ہے۔

جولائی 2006 کے شمارے میں محمد عمر رضا نے اپنے مضمون ''تمباکو نوشی'' میں حیرت انگیز اعداد و شمار فراہم کیے ہیں۔ ہمارے ملک میں تمباکو نوشی سے ہر سال دس لاکھ اور پوری دنیا میں پچاس لاکھ اموات ہوتی ہیں۔ عالمی تنظیم صحت کے مطابق دنیا میں موت کی دوسری سب سے بڑی وجہ تمباکو نوشی کو ہی بتایا گیا ہے۔ برٹش میڈیکل جرنل کے مطابق تمباکو نوشی انسان میں گلوکوز کو برداشت کرنے کی صلاحیت کم کر دیتی ہے جو آخر کار ذیابیطس کا روپ اختیار کر لیتی ہے۔

(روز نامہ راشٹریہ سہارا، نئی دہلی، 2 جولائی 2006، ص 7)

''اشتہارات کے ذریعے معلومات و پیامات کا فروغ'' میں سید حزل الدین نے اشتہارات کو موثر بنانے کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ بلاشبہ اشتہارات نے زندگی کا انداز بدل ڈالا ہے۔ اب اکثر چیزوں کی خرید و فروخت اشتہارات کی معلومات کی بنیاد پر ہی ہوتی ہے۔ لیکن بعض اشتہارات جھوٹ کا پلندہ ہوتے ہیں۔ چیزوں کی فروخت کو فروغ دینے کے لیے دروغ گوئی کا سہارا لیا جاتا ہے۔ کیا صارفین کو گمراہ کرنے کی قانون نے پوری طرح چھوٹ دے رکھی ہے؟

اسٹیفن ہاکنگ کی شخصیت عزم و ارادے کا ایک پیکر ہے۔ یہ صرف معذور لوگوں کے لیے ہی ہمت و حوصلے کا پیغام نہیں بلکہ ہر شخص کے لیے سبق آموز ہے۔

مستقل عنوانات میں ''اردو خبر نامہ'' اور ''تبصرہ و تعارف'' خاصے معلومات افزا ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی بعض تبصرے زیادہ طویل ہو جاتے ہیں۔

ماہ نامہ ''اردو دنیا'' صحافت کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دے رہا ہے۔ آپ نے اپنی مطبوعات یا تاریخ کے اوراق سے اہم اقتباسات یا مختصر ابواب نقل کر کے ایک ایسا سلسلہ شروع کیا ہے جو بہت مفید ہے۔

■ **غزالہ نگار، کاشانۂ شفیق، ملارنا ڈونگر، سوائی مادھو پور، راجستھان۔ 322028**

جولائی 2006 کا شمارہ موصول ہوا۔ ''ہماری بات'' کے تحت پیش کردہ فکر انگیز خیالات آپ کی روشن خیالی کے غماز ہیں۔ بلاشبہ ان ننھے منے اسکولی بچوں کے لیے بستوں کا وزن بار گراں سے کم نہیں جو انھیں طرح طرح کی نفسیاتی و جسمانی بیماریوں میں مبتلا کر رہا ہے۔ ماہرین تعلیم کے لیے اس پریشانی کا ایک مناسب حل تلاش کرنا بہت ضروری ہے اس میں مزید تاخیر ہمارے ملک کے روشن مستقبل کو متاثر کر سکتی ہے۔ سرورق پر اسکولی بچی کی پیاری سی تصویر نہایت دلکش ہے اور آپ کے اداریے کی غمازی کرتی ہے۔

'روبرو' کے تحت پروفیسر علی رفاد فتیحی سے کی گئی فیروز عالم کی گفتگو اس شمارے کا حاصل ہے۔ پروفیسر فتیحی کا تعلق علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات سے ہے، آپ کی علمی و ادبی حیثیت ایک خوش فکر مفکر و مدبر کی ہے۔ اس گفتگو میں پروفیسر فتیحی کی جملہ ادبی فتوحات اور افکار و نظریات یکجا ہو گئے ہیں۔ انھوں نے لسانیات اور ملک میں اردو کی صورت حال پر بڑی کارآمد گفتگو کی ہے۔

زبان اور تعلیم کے موضوع پر اعجاز مسیح، ریاض احمد اور اشوک گانگولی کے مضامین فکری اور معلوماتی ہیں۔ وودھا کول کا مضمون آپ کے اداریے (ہماری بات) کا ضمیمہ کہا جا سکتا ہے۔ رضاء الرحمٰن عاکف کا مضمون اردو طباعت و کتابت کے تاریخی سفر کا اجمالی جائزہ پیش کرتا ہے۔ ان جملہ مضامین کا انتخاب آپ کے حسن انتخاب کی غمازی کرتا ہے جس کے لیے مبارکباد قبول فرمائیں۔

ایم ایس سوامی ناتھن اور محمد عمر رضا کے مضامین سائنس اور صحت کے حوالے سے لائق مطالعہ ہیں علاوہ ازیں سید حزل الدین، ندیم احمد اور عبدالواحد کے مختلف مضامین بھی اپنے موضوعات کا احاطہ کرتے ہیں۔

ادب کے خانے میں فارسی زبان کے مشہور و معروف افسانہ نگار صادق ہدایت کے ایک افسانے 'داش آکل' کو جگہ دی گئی ہے علاوہ ازیں افسانے کے آغاز میں صادق ہدایت کا اجمالاً تعارف بھی پیش کر دیا گیا ہے جو صادق ہدایت سے متعلق غیر فارسی داں قارئین کی معلومات میں بطور خاص اضافہ کرتا ہے۔ ''داش آکل'' کا ترجمہ ممتاز احمد نے بڑی محنت سے کیا ہے۔

درگھ پال سنگھ بھنڈاری کا مضمون سارک ممالک کی تنظیم کا مکمل تعارف کراتا ہے۔ بھنڈاری کے اس مضمون کا اردو ترجمہ مشرف علی نے خوش اسلوبی سے کیا ہے۔ اردو خبر نامہ، کتابوں پر تبصرے اور بچوں کا گوشہ قارئین کی دلچسپی کا باعث ہیں۔

■ **رضوان خاں، 96 شیخ سرائے، سیتاپور۔ 261001**

''اردو دنیا'' بابت جولائی 2006 موصول ہوا۔ سرورق پر بستے کا بوجھ لادے ہوئے اسکولی بچے کی تصویر اور انگریزی ادیب آر کے نارائن کے کہے ہوئے جملے

دیکھ کر خیز اداریہ کا مطالعہ کر کے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ آپ بچوں پر کیے جا رہے اس دانستہ/نادانستہ ظلم کے تئیں بے حد متفکر ہیں۔ میں آپ کی اس بات سے بھی متفق ہوں کہ ضرورت اس بات کی ہے کہ نصاب کو آسان بنایا جائے اور ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جس سے بچوں کو زیادہ وزنی تھیلا بھی نہ ڈھونا پڑے اور ان کی صلاحیتوں میں بھی اضافہ ہو۔ تعلیمی عمل کو بچوں کے لیے دلچسپ بنانے کی کوشش کی جائے تاکہ وہ اسکول جانے سے کترانے کی بجائے خوش خوش اسکول جائیں اور آموزشی عمل ان کے لیے بوجھ نہ بنے۔ اس شمارے میں مضمون "اردو طباعت کا سفر" بڑی اہمیت کا حامل ہے، گو مضمون نگار نے بڑے اختصار سے کام لیا ہے۔ تمباکو نوشی پر جناب محمد عمر رضا کا مضمون بھی پسند آیا۔ بے شک تمباکو اور تمباکو سے بنی مصنوعات کا کسی بھی شکل میں استعمال صحت کے لیے مضر ہے۔ "سارک" کے حوالے سے شائع شدہ مضمون ہماری معلومات عامہ میں اضافہ کرتا ہے۔

■ ایس.آئی.ایچ.کاظمی، 338۔دلچھیاں، جموں۔180001 (جموں وکشمیر)

زیر نظر شمارے (جولائی 2006) کا اداریہ بہت اہمیت کا حامل ہے بشرطیکہ ارباب اختیار اس اہم مسئلے کی طرف ایمانداری سے رجوع کریں۔ ہمیں بھی اکثر ان بچوں کو دیکھ کر ایک عجیب کیفیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے جن کے نازک کندھوں پر کتابوں اور کاپیوں کا ناقابل برداشت بوجھ ڈال دیا جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ سروے کے اعداد و شمار بھی ماہرین تعلیم کو گہری نیند سے جگانے کے لیے کافی ثابت نہیں ہو رہے ہیں۔ اگر ہمیں کل چاق و چوبند اور توانا انسانوں کی کھیپ جاری و ساری رکھنی ہے تاکہ وہ ملک کی ترقی میں اپنا کردار ادا کر سکیں تو بستوں کا وزن کم کرنے کی طرف سے لاپرواہی نہیں برتی جانی چاہیے۔

کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ Routine میں روزانہ ہر مضمون پڑھائے جانے کی بہ نسبت مناسب درجہ بندی کی جائے۔ یعنی پانچ یا چھ مضامین میں سے دو یا تین ایک روز اور دوسرے اگلے روز پڑھایا جائے۔ اس سے تھیلے کا وزن کم ہو جائے گا اور میرے خیال میں اساتذہ کے لیے بھی کچھ آسانی ہو جائے گی۔

اردو تعلیم کے حوالے سے اعجاز مسیح (چند غیر روایتی تدریسی طریقے) اور ریاض احمد (اردو نصاب سیکنڈری اور سینئر سیکنڈری سطح پر) کے مضامین پسند آئے۔ ماہرین تعلیم اور ارباب عقل و عقد کو اس طرف بھی توجہ دینی چاہیے۔ جموں و کشمیر میں اردو آئینی اور سرکاری زبان ہے لیکن یہاں اردو کے ساتھ جو زیادتیاں جان بوجھ کر کی جا رہی ہیں ان میں چند کی نشان دہی تو ریاض احمد نے اپنے مضمون میں کی ہے لیکن اس کے علاوہ ہر اردو کی کتاب میں ایسی سیکڑوں خامیاں مل جائیں گی جو یقیناً ایک اچھے طالب علم کے لیے زبان کو سمجھنے میں مشکلات پیدا کر سکتی ہیں۔

دیگر مشمولات بھی اپنی اپنی جگہ خوب ہیں۔ افسانہ "داش آکل" بہت پسند آیا۔

■ محمود سعیدی، سی 3/141۔سی، کرشنا کنج ایکسٹنشن، لکشمی نگر، نئی دہلی

جولائی کے "اردو دنیا" میں آپ نے نجے گوڈ بولے صاحب کی کتاب "جانشین داغ بھائی جان عاشق" پر میرا تبصرہ شائع کیا ہے۔ اس کے لیے شکریہ مگر تبصرے کے شروع میں جو تین پیراگراف گوڈ بولے صاحب کے تعارف میں دیے گئے ہیں وہ کہاں سے اس تبصرے میں آ شامل ہوئے، میں نہیں جانتا، اتنا جانتا ہوں کہ یہ میرے لکھے ہوئے نہیں ہیں۔

متذکرہ یہ تین پیراگراف در اصل ادارے کی جانب سے سنجے گوڈ بولے کے تعارف کے طور پر دیے گئے ہیں لیکن یہاں غلطی سے ادارہ کمپوز ہونے سے رہ گیا۔ ہم اس کے لیے معذرت خواہ ہیں۔ (ادارہ)

■ محمد ناظم علی، نظام آباد، آندھرا پردیش۔503002

جولائی 2006 کا اردو دنیا موصول ہوا۔ جب اس کا مطالعہ کیا تو یہ محسوس ہوا کہ اس کے مشمولات مخزن العلوم کے مماثل ہیں۔ اس میں زبان، تعلیم، سائنس، تاریخ، صحافت، شخصیات، قانون اور ادب وغیرہ مختلف موضوعات پر مضامین پڑھنے کو ملتے ہیں۔ عالمگیریت کے اس عہد میں اردو والوں اور اردو ماحول کے لیے ایسے ہی ماہ نامے کی ضرورت ہے۔ اعجاز مسیح اور ریاض احمد کے مضامین خوب ہیں۔ یہ رسالہ ہر اردو خاندان کے لیے ناگزیر ہے۔

■ شاغل ادیب، 3/9/304/4-1 زیب منزل، مشیر آباد، حیدر آباد، 48

"اردو دنیا" کا شمارہ جولائی 2006 باصرہ نواز ہوا۔ ہمیشہ کی طرح اس ماہ بھی آپ کا اداریہ، جو اسکول کے نصاب میں بے ترتیبی و زیادتی کے سبب ننھے منھے بچوں اور بچیوں کا اپنی پیٹھ پر کتابوں سے بھرے تھیلے لے جانے اور مختلف امراض کا شکار ہو جانے سے متعلق ہے، خوب ہے۔ اسے پڑھ کر مجھے جلال عارف کا یہ مقطع یاد آیا۔

آج کے بچے بھی عارف کیا کوئی مزدور ہیں
جو کتابوں سے بھری یہ بوریاں لے کر چلے

"زبان اور تعلیم" سے متعلق سبھی مضامین اچھے ہیں۔ شخصیات میں "اسٹیفن ہاکنگ" نے بے حد متاثر کیا۔ صادق ہدایت کی کہانی — "داش آکل" نے بھی بے حد متاثر کیا۔ اس کہانی کا اہم کردار "" "داش آکل" برے لوگوں میں چھپی ہوئی اچھائی اور نیک خصلتوں کی کامیاب عکاسی کرتا ہے۔ شمارے کے دیگر مشمولات بھی معیاری ہیں۔

■ محمد عبدالوہاب، راجہ پٹیل، ادگیر 413517، مہاراشٹر

جون 2006 کا تازہ شمارہ دستیاب ہوا۔ نوشاد صاحب سے متعلق "ہماری

بات'' کے تحت معلومات فراہم کرا کے آپ نے کماحقہٗ حق تعزیت ادا کر دیا ہے۔فرید احمد برکاتی کا مضمون اردو میں مستعمل عربی مرکبات کیسے پڑھیں بہت پسند آیا جو طلبہ و اساتذہ دونوں کے لیے یکساں مفید ہے۔

''آپ کی بات'' کے تحت میں محترمہ غزالہ نگار کی اس بات سے پوری طرح متفق ہوں جو انھوں نے اردو اکادمیوں کے متعلق لکھا ہے اور راجستھان اردو اکادمی کی مثال دیتے ہوئے صاحبان اردو کی بے حسی پر افسوس ظاہر کیا ہے۔حکومت کو چاہیے کہ سیاسی ریشہ دوانیوں کا شکار نہ ہوتے ہوئے پورے انصاف کے ساتھ اردو زبان کے فروغ کے لیے مناسب اقدامات اٹھائیں تاکہ صاحبانِ اردو کی بے حسی بھی دور ہو اور اردو عوام کا حوصلہ بھی بڑھے۔

■ **ڈاکٹر نثار راہی، کھنڈ افالہ، نزد یتیم خانہ، جودھ پور (راجستھان)**

''اردو دنیا'' جون کا شمارہ ملا۔''غلام علی سے گفتگو'' ان کے دل میں ہمارے ملک کے تئیں محبت کا والہانہ اظہار ہے۔اسد فیض کا مضمون پاکستانی مطبوعات کی معلومات فراہم کرتا ہے۔موسیقار نوشاد کے ساتھ ہندوستانی سنگیت کا ایک عہد ختم ہوا جس کی تائید میں لکھے گئے سرور یوسف اور سید امتیاز الدین کے مضامین شمارے کی جان ہیں۔

■ **محمد شاہد، مالیر کوٹلہ، ضلع سنگرور، پنجاب**

جون 2006 کا شمارہ باصرہ نواز ہوا۔آپ نے نوشاد صاحب پر گوشہ شامل کر کے اس شمارے کو مزید وقیع بنا دیا ہے۔مشمولات میں سید اقبال امروہوی کا مضمون علمیت سے بھرپور ہونے کے ساتھ دلچسپ بھی ہے۔اسد فیض کا مضمون سرسری جائزہ ہونے کے باوجود اہم ہے۔ان کے علاوہ دیگر مشمولات اور تبصرے خوب ہیں۔

■ **ڈاکٹر نیاز سلطان پوری، بھٹی جرولی، کٹاواں سلطان پور، یو. پی.**

عظیم موسیقار نوشاد پر آپ نے گوشہ شائع کر کے ''ہندوستانی کلاسیکی موسیقی اور موسیقار نوشاد علی کو بہترین خراج عقیدت پیش کیا ہے۔''کرائے کی ممتا'' اور ''نصوح اور علیم کی گفتگو'' پسند آئے۔''اردو میں مستعمل عربی مرکبات کیسے پڑھیں'' بھی سیر حاصل اور افادیت کا حامل مضمون ہے۔

■ **رشید صدیقی، فوٹو گرافر، 2-3-847/k/1، پریم نگر، حیدرآباد۔13**

''اردو دنیا'' میں بہت کچھ ہے، خبر نامہ، تبصرہ، تعارف، ظرافت، اہم باتیں کارآمد معلومات۔مزے کی بات یہ ہے کہ ہر ماہ کی پہلی تاریخ کو پوسٹ مین رسالہ دے جاتا ہے۔آپ کی کارآمد، کامیاب ادارت کے لیے مبارکباد۔

■ **محمد سلیمان راہی، صدر، مسلم ویلفیئر کمیٹی، مالیر کوٹلہ، پنجاب**

''اردو دنیا'' میں مضامین کا انتخاب قابلِ داد ہے۔اس کے ذریعے کونسل کی سرگرمیوں سے بھی واقفیت ہوتی رہتی ہے۔اردو کو روزی روٹی سے مربوط کرنے سے متعلق کونسل کے منصوبے وقت کی ایک بڑی ضرورت ہیں۔اس سلسلے میں اردو کمپیوٹر مراکز کا قیام نہایت خوش آئند قدم ہے۔تین سال پہلے تک ہمارا شہر اس مرکز سے محروم تھا لیکن آپ نے دارالسلام میں کمپیوٹر سینٹر قائم کر کے ہماری ایک بڑی ضرورت کو پورا کر دیا ہے۔

■ **محمد فیاض حسین، جامعہ عربیہ گلزار حسینیہ، اجراڑہ، ضلع میرٹھ۔**

''اردو دنیا'' ماہ اپریل کا شمارہ نظر نواز ہوا۔شمارے میں رشید حسن خاں مرحوم و مغفور کی خدمات کو جس طرح سراہا گیا ہے اور اردو دوست حضرات نے جس طرح ان کی پذیرائی کی ہے نیز احباب و رفقا نے جن کلمات اور دل کی گہرائی سے ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ لائق تحسین ہے۔خلیق انجم، قمر رئیس، صدیق الرحمٰن قدوائی، مخمور سعیدی، اسلم پرویز، اشفاق محمد خاں، گیان چند جین اور تنویر احمد علوی کے مضامین بے حد پسند آئے۔''کچھ اصولِ تحقیق کے بارے میں'' اور ''پہیلیوں سے متعلق چند باتیں'' عمدہ انتخاب ہیں۔علاوہ ازیں ساجدہ زیدی اور سکندر احمد صاحب سے گفتگو کے جو اقتباسات پیش کیے گئے ہیں وہ بھی بے حد دلچسپ ہیں۔

اردو دنیا ایک ایسا معیاری رسالہ ہے جو نئی نسل کے لیے ہر ماہ نئی امنگ، نیا حوصلہ اور نیا پیغام لے کر آتا ہے جس سے ان کے اندر تعلیمی بیداری اور اردو کے تئیں جوش و ولولہ بڑھ رہا ہے اور انھیں اپنے مستقبل کو تابناک اور درخشندہ بنانے میں رسالے سے بہت رہنمائی مل رہی ہے۔

□□□

مراسلات اور مضامین صاف اور خوش خط ارسال فرمائیں۔

(ادارہ)

ہماری بات

اردو صحافت کی تاریخ میں 2006 اس لیے یاد رکھا جائے گا کہ اس سال جہاں ماہنامہ ''شب خون'' چالیس سال تک علم و ادب کی بے مثال خدمت کے بعد بند ہوا وہیں ''ادب ساز'' اور ''جہان غالب'' جیسے نئے رسائل بڑی آب و تاب کے ساتھ ادبی افق پر نمودار ہوئے۔ اس سال ''شاعر'' ممبئی نے اپنی اشاعت کے پچھتر برس اور ''رہنمائے تعلیم'' دہلی نے سو سال پورے کیے۔ یہ امر خوش آئند ہے کہ اردو کے ادبی رسائل ملک کے مختلف گوشوں سے شائع ہو رہے ہیں اور اپنی بساط بھر زبان و ادب کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔

اگرچہ رسائل کی بھیڑ میں ہمیں شب خون، سوغات، کتاب، سطور، تحریک، محور، تلاش، تخلیق، شاہراہ اور فنکار کی کمی ہمیشہ کھٹکتی رہے گی لیکن جو رسائل شائع ہو رہے ہیں وہ سب اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ان رسائل میں تخلیقی ادب، تحقیق اور تنقید کے ساتھ ساتھ دیگر زبانوں کے تراجم بھی شائع ہو رہے ہیں جن سے ہمیں دوسری زبانوں اور یہ زبانیں جن تہذیبوں اور ثقافتوں کی ترجمانی کرتی ہیں ان کے بارے میں ایسی آگہی حاصل ہوتی ہے جو شاید دوسرے ذرائع سے ممکن نہ ہو۔

عام طور سے یہ شکایت کی جاتی ہے کہ قارئین اردو کتب و رسائل خرید کر نہیں پڑھتے اور مانگ کر پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ لیکن یہ صرف جزوی صداقت ہے۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ جب قارئین ہی نہیں ہیں تو رسائل کی اشاعت کا جواز کیا ہے اور ان کے مالکان دیدہ و دانستہ یہ گھاٹے کا سودا کیوں کرتے ہیں؟ یہ سچ ہے کہ اردو والوں کی اکثریت متوسط اور نچلے متوسط طبقے سے تعلق رکھتی ہے اور ان میں سے زیادہ تر کی جیب کتب و رسائل کی خریداری کی اجازت نہیں دیتی لیکن اس کے باوجود اگر پورے ملک میں سیکڑوں رسائل شائع ہو رہے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ قارئین کا ایک بڑا حلقہ موجود ہے۔ اپنے پسندیدہ رسائل سے ان کے لگاؤ کا یہ عالم ہے کہ اگر کبھی کسی وجہ سے انھیں کوئی شمارہ نہیں مل پاتا تو وہ مضطرب ہو جاتے ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ اردو رسائل کو دقتوں اور پریشانیوں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا لیکن یہ صرف اردو رسائل کے ساتھ ہی نہیں ہے بلکہ موجودہ اطلاعاتی تکنیک کے زمانے میں ہر زبان کے رسائل کو اپنی بقا کا مسئلہ درپیش ہے۔

حالیہ دنوں میں ملک میں اردو کے لیے فضا مزید سازگار ہوئی ہے اور اردو پڑھنے والوں کی تعداد بھی بڑھی ہے۔ اگر اردو کے ادبی رسائل کے مدیران، مالکان قارئین کی تعداد بڑھانے کے لیے کسی موثر حکمت عملی کے تحت کام کریں اور مارکیٹنگ کے جدید طریقوں سے استفادہ کرتے ہوئے اپنے رسائل کی تشہیر کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ عوام اپنے روزمرہ کے اخراجات میں سے کچھ حصہ اردو کے رسائل کے لیے مختص نہ کریں۔ گذشتہ برس قومی اردو کونسل نے دہلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی، اور جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تجرباتی طور پر ایک دن کے لیے اسٹال لگایا اور اردو داں طلبہ اور اساتذہ کو ''فکر و تحقیق'' اور ''اردو دنیا'' کا مستقل خریدار بنانے کی مہم شروع کی۔ اس میں خاطر خواہ کامیابی ملی اور خاصی تعداد میں نہ صرف لوگوں نے ان رسائل کی سالانہ رکنیت قبول کی بلکہ پرانے شمارے بھی خریدے۔

آج پورے ملک میں اردو کے رسائل پر اگر ہم ایک طائرانہ نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ مختلف بڑے اور چھوٹے شہروں سے اچھی خاصی تعداد میں مختلف موضوعات مثلاً ادبی، نیم ادبی، مذہبی، سائنسی، طبی، سیاسی، ثقافتی، خواتین اور بچوں کے رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ صرف ادبی رسائل کو ہی لیں تو ان کی تعداد بھی کم نہیں ہے۔ دہلی سے فکر و تحقیق، آج کل، ایوان اردو، کتاب نما، اردو ادب، جامعہ، غالب نامہ، جہان غالب، ذہن جدید، استعارہ، نیا سفر، ادب ساز، عالمی اردو ادب، اردو بک ریویو، رہنمائے تعلیم، جہان کتب، حیدرآباد سے شعر و حکمت، قومی زبان، سب رس، شگوفہ، خوشبو کا سفر، اقبال ریویو، ممبئی سے شاعر، ہندوستانی زبان، نیا ورق، تکمیل، نوائے ادب اور اردو چینل، پونے سے اسباق، پٹنہ سے زبان و ادب، مباحثہ، مریخ، دربھنگہ سے جہان اردو اور تمثیل نو، گیا سے ترسیل، سہیل، رانچی سے عہد نامہ، بھاگلپور سے ابسار، بھوپال سے تمثیل، فکر و آگہی، صدائے اردو، شملہ سے جدید فکر و فن، لکھنؤ سے نیا دور، گلبن، امکان، کولکاتہ سے مژگاں، انشا، اثبات و نفی، ترکش، روح ادب، علی گڑھ سے فکر و نظر اور تہذیب الاخلاق، بھوبنیشور سے فروغ ادب، کٹک سے ترویج، ناگپور سے قرطاس، پنچکولہ سے تمنا تت، سری نگر سے بازیافت، شیرازہ، سرونج (مدھیہ پردیش) سے انتساب کے علاوہ دیگر بہت سارے رسائل ملک کے مختلف شہروں سے پابندی سے شائع ہو رہے ہیں۔ ادب اطفال کے ذیل میں بھی امنگ (دہلی)، پیام تعلیم (دہلی)، نور (رام پور)، بچوں کا ہلال (رام پور)، ہمارا نونہال (حیدر آباد) اور گل بوٹے (ممبئی) وغیرہ رسائل اہم خدمات انجام دے رہے ہیں۔

مجموعی طور پر اردو کی ادبی صحافت کی صورت حال مایوس کن نہیں ہے لیکن اسے مزید روشن کرنے کے لیے سنجیدہ کوششیں لازمی ہیں۔ صحت مند معاشرے کے لیے صحت مند ادب کی تخلیق ضروری ہے اور صحت مند تخلیق کو جلا بخشنے کے لیے ضروری ہے کہ اردو کے ادبی رسائل کی مشکلات اور پریشانیوں کو دور کرنے کی سنجیدہ کوششیں کی جائیں۔

اردو کی طرح مراٹھی اور بنگالی زبانیں بھی نسبتاً کم عمر ہیں لیکن یہ زبانیں بولنے والے کتابوں اور رسالوں کے مطالعے کو اپنے معمولات کا حصہ بنائے ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان زبانوں میں چھپنے والی کتابوں اور رسالوں کی تعداد اشاعت ہزاروں اور کبھی کبھی لاکھوں تک پہنچ جاتی ہے۔ ان زبانوں کے برعکس جو اپنے اپنے علاقوں ہی میں بولی اور سمجھی جاتی ہیں، اردو بولنے والے اور سمجھنے والے ملک بھر میں پھیلے ہوئے ہیں اگر وہ اردو اخبارات و رسائل کے مطالعے کو اپنے معمولات میں شامل کرلیں تو صورت حال کچھ سے کچھ ہو سکتی ہے۔

□□□

ممتاز عالم

عابد سہیل سے گفتگو

جناب عابد سہیل ہمارے بزرگ قلم کاروں میں سے ہیں۔ ان کی تحریروں خصوصاً افسانوں اور خاکوں کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک بار انھیں شروع کرکے آپ انھیں پورا پڑھے بغیر چین نہیں لے سکتے۔ عابد سہیل صاحب نے افسانوں اور خاکوں کے علاوہ تراجم بھی کیے ہیں اور اوائل عمری سے ہی صحافت سے وابستہ رہے ہیں۔ عابد سہیل صاحب کی پیدائش 29 نومبر 1932 کو ہوئی۔ آپ نے لکھنؤ یونیورسٹی سے فلسفہ میں ایم۔اے۔ کیا۔ آپ 1952 سے 1961 تک روزنامہ ''قومی آواز'' سے اور 1961 سے 1986 تک انگریزی روزنامہ ''نیشنل ہیرالڈ'' سے وابستہ رہے۔ 1995 سے 1997 تک آپ نے ''پائنیر'' میں بھی کام کیا۔ آپ نے ماہنامہ ''کتاب'' 1962 میں جاری کیا جو پابندی سے 1976 تک شائع ہوا۔ آپ گذشتہ آٹھ برس سے ''ٹائمس آف انڈیا'' لکھنؤ کے لیے ہفت روزہ کالم ''اردو پریس'' تحریر کر رہے ہیں جو قارئین میں بے حد مقبول ہے علاوہ ازیں روزنامہ ''صحافت'' کے سنڈے میگزین کی ادارت کی ذمہ داری بھی سنبھالے ہوئے ہیں۔

جناب عابد سہیل کی مندرجہ ذیل کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

''اردو کے ادبی رسالوں کے مسائل''، ''مضامین احمد جمال پاشا''، ''سب سے چھوٹا غم'' (افسانوی مجموعہ)، ''فکشن کی تنقید—چند مباحث'' (تنقید) ''جینے والے'' (افسانوی مجموعہ)، ''کھلی کتاب'' (خاکے)، باغات (ترجمہ)۔ نیا افسانوی مجموعہ ''غلام گردش'' جلد ہی منظر عام پر آ رہا ہے۔ ''آندھیوں کی فصل'' کے عنوان سے آپ ایک ناول بھی تحریر کر رہے ہیں۔

جناب عابد سہیل کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں متعدد انعامات ان کی خدمت میں پیش کیے گئے ہیں جن میں غالب انسٹی ٹیوٹ کا غالب ایوارڈ، یو۔پی۔ اردو اکادمی انعام، بنگال اردو اکادمی انعام (جینے والے'' اور ''فکشن کی تنقید'' پر) یو۔پی۔ اردو اکادمی انعام (''جینے والے'' اور سب سے چھوٹا غم'' پر) بہار اردو اکادمی انعام (''جینے والے'' پر) اور پچاس سالہ صحافتی خدمات کے لیے حکومت اتر پردیش کی جانب سے دیا جانے والا انعام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

جناب عابد سہیل سے کی گئی گفتگو کے اہم اقتباسات قارئین ''اردو دنیا'' کے لیے پیش ہیں۔

سوال: افسانہ نگاری کے علاوہ آپ کو فکشن کی تنقید، خاکہ نگاری اور تراجم سے بھی دلچسپی ہے لیکن خود آپ کی نظر میں ان تینوں میں سے اولیت کس کو حاصل ہے؟

جواب: ظاہر ہے افسانہ نگاری کو۔ لیکن ادب کے حوالے سے میری پہلی محبت کتابوں سے ہے۔ میرے خیال میں دوسرے اور تیسرے درجے کا ادب تخلیق کرنے کی بجائے اول درجے کے ادب کا مطالعہ کرنا زیادہ بہتر ہے۔

سوال: اس سلسلے میں آپ سے اختلاف کرنا مشکل ہے تاہم چوں کہ بطور تخلیق کار آپ کی شناخت بطور افسانہ نگار ہے، آپ نے فکشن کی تنقید پر بھی ایک فکر انگیز کتاب لکھی ہے۔ آپ کی نظر میں افسانے کی سب سے بڑی خوبی کیا ہو سکتی ہے؟

جواب: یہی کہ قاری اسے پڑھنے پر مجبور ہو جائے اور اس میں زندہ رہنے کی سکت ہو۔ افسانے کے سلسلے کی ساری بحثیں، خواہ وہ تکنیک سے متعلق ہوں یا واقعہ سے، کردار سے متعلق ہوں یا اسے قابل قبول بنانے سے، ان کا تعلق اسی بنیادی خوبی سے ہوتا ہے۔

سوال: کیا مقبولیت سے افسانے کے ہنر کا کوئی تعلق نہیں اور اگر ہے تو پاپولر ادب کی مقبولیت اور اچھے ادب کی مقبولیت میں کیا فرق ہوتا ہے؟

جواب: دیکھیے، مقبول دونوں ہی ہوتے ہیں بلکہ یہ بھی ممکن ہے کہ فوری طور پر پاپولر ادب اچھے ادب سے زیادہ مقبول ہو جائے۔ ایک افسانہ نگار نے اپنے ایک حالیہ مضمون میں لکھا کہ 1950 کے آخر میں یا اس کے چند سال بعد دہلی کے ایک ادارے نے ایک ناول کا پچاس ہزار کا ایڈیشن چھاپا تھا۔ میں نہیں سمجھتا کہ یہ افتخار اردو کے بڑے سے

بڑے ناول کو حاصل ہوا ہو۔ چنانچہ صرف مقبولیت کو پیمانہ بنایا جائے تو پاپولر ناول ادبی شہ پارہ قرار پائے گا۔لیکن یہ ہوتا نہیں۔ پاپولر ناول یا پاپولر ادب عموماً مستعجل ہوتا ہے۔ایک بار بھڑکا اور بجھ گیا۔اس سلسلے میں جس ناول کا ذکر کیا گیا ہے اس کا دوسرا ایڈیشن نہ اب تک شائع ہوا ہے اور نہ شاید کبھی شائع ہوگا۔ برخلاف اس کے امراؤ جان ادا، گئودان، آگ کا دریا، اداس نسلیں اور خدا کی بستی کے ایڈیشن کم سے کم ہر دوسرے سال ضرور شائع ہو جاتے ہیں اور یہ سلسلہ کئی زبانوں تک پھیلا ہوا ہے۔ چنانچہ مقبولیت تو دونوں طرح کی کتابوں میں مشترک عنصر ہے لیکن اچھے ادب میں زندہ رہنے کی سکت ہوتی ہے اور وہ پاپولر ادب کے برخلاف انسانی شعور کا حصہ بن جاتا ہے اور بار بار پڑھا جاتا ہے۔

سوال: آپ کے خیال میں افسانہ، ناولٹ اور ناول میں بنیادی فرق کیا ہوتا ہے۔کیا اس سلسلے میں کوئی فیصلہ ضخامت کی بنیاد پر کیا جا سکتا ہے؟

جواب: جی نہیں، صفحات کی تعداد فیصلہ کن نہیں ہو سکتی۔لیکن آگے بڑھنے سے پہلے یہ بھی عرض کرنا چاہوں گا کہ ناولٹ کی اصطلاح اب سکۂ رائج الوقت نہیں ہے۔ یہ اصطلاح بیسویں صدی کی چوتھی دہائی کی ہے اور پانچویں دہائی میں مسترد کردی گئی تھی۔انھی دنوں کم وبیش سو، ڈیڑھ سو صفحات کے Room At the Top کو ناول ہی قرار دیا گیا تھا۔چنانچہ اب مقابلہ افسانے اور ناول کا ہے۔یہ تو سب ہی تسلیم کریں گے کہ صفحات یا ضخامت کے اعتبار سے ناول طویل سے طویل افسانے سے بڑا ہوتا ہے۔لیکن کیوں؟ دراصل افسانوی ادب میں سارا مقابلہ رشتوں کا ہوتا ہے۔رشتہ انسان اور انسان کے درمیان، انسان اور دنیا کے درمیان اور انسان کا خود اپنے ساتھ۔ افسانے میں یہ رشتے پاس پاس ہونے کے علاوہ مقابلتاً کم مدت میں تشکیل پاتے ہیں جب کہ ناول میں ان رشتوں کی مار دور دور تک پڑتی ہے۔اب چونکہ ان رشتوں کا اظہار قضیوں (Proposition) کے ذریعے ہوتا ہے اس لیے ظاہر ہے دور تک پھیلے ہوئے رشتے، ان کی نفاستیں اور نزاکتیں، ساجی معاملات، گہرائیاں، الجھاوے اور سروکار زیادہ جگہ گھیرتے ہیں۔تخلیق کی دنیا بڑی ہوگی تو ظاہر ہے وہ زیادہ جگہ بھی گھیرے گی۔

میرا خیال ہے کہ ناولٹ کی اصطلاح طویل افسانے کے متبادل کے طور پر استعمال کی جانے لگی تھی۔

سوال: کہا جاتا ہے کہ ناول میں اپنی ضخامت کے سبب غیر متعلق واقعات اور معاملات کو پیش کرنے کی آزادی ہوتی ہے۔یعنی ایسے واقعات بھی اس میں پیش کیے جا سکتے ہیں جن کا اصل کہانی سے لازمی طور پر کوئی تعلق نہ ہو؟

جواب: شاید ایسا نہیں ہے۔یہ ہوتا تو ہم Fathers and Sons ایسے نہایت عمدہ لیکن مقابلتاً کم ضخیم ناول اور بزراف (Buzarov) ایسے کردار سے محروم رہ جاتے اور زیادہ تر، بلکہ شاید ہر ناول، غیر معمولی طور سے طویل ہوتا۔

افسانے کی طرح ناول میں بھی ہر واقعہ، ہر موڑ، ہر مکالمہ کسی نہ کسی طرح اس کے Thrust کو زیادہ معنی خیز بنانے کے علاوہ مجموعی فضا کی تشکیل میں معاون ہوتا ہے۔چنانچہ کسی بھی ناول کے ایسے حصوں کی حیثیت جو کوئی بھی کام انجام نہیں دیتے حشو وزوائد سے زیادہ نہ ہوگی اور ان کی موجودگی کو ناول کا نقص ہی قرار دیا جائے گا۔

سوال: افسانے کی موجودہ صورت حال کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا نئی نسل کے افسانہ نگار عمدہ تخلیقات پیش کر رہے ہیں اور اگر آپ کے خیال میں ان کا تخلیقی سفر اطمینان بخش ہے تو کیا ان کی تخلیقات ان بلندیوں کو چھو سکتی ہیں جو کرشن چندر، بیدی اور عصمت چغتائی وغیرہ کے افسانوں میں ملتی ہیں؟

جواب: آج کے افسانے سے اگر ہم وہ سارے افسانے مراد لیں جو آج لکھے جا رہے ہیں، اور یقیناً ایسا ہی ہے، تو ان کے لکھنے والوں کو تین نسلوں میں تقسیم کرنا ہوگا۔ جہاں تک تعلق ادب کا ہے، وہ فکشن ہو یا شاعری، تین نسلیں ہمہ وقت تخلیق کے عمل میں مصروف رہتی ہیں۔ یہاں ہمہ وقت سے مراد ہی ہر لمحے، ہر زمانے اور ہر دور ہے۔ان میں سے ایک نسل وہ ہوتی ہے جو عمر کے اعتبار سے ساٹھ کے آس پاس ہوتی ہے۔یہ نسل اپنی اقدار اور اپنے مسلمات کو تبدیل شدہ صورت سے ہم آہنگ کرنے میں معروف نظر آتی ہے اور دوسری وہ جس نے قدم جما لیے ہیں۔اس کی کوشش ہوتی ہے کہ ماضی سے رشتے بالکل ہی منقطع نہ ہو جائیں۔آپ کا سوال شاید اسی نسل کے بارے میں ہے اور تیسری نسل وہ ہوتی ہے جو ادب کی دنیا میں بس ابھی داخل ہوئی ہو۔

آپ کا سوال اس نسل کے بارے میں ہے جس نے اپنا تخلیقی سفر 1970-80 کے درمیان شروع کیا تھا۔آپ کی مراد شاید اسی نسل

کے کارناموں سے ہے۔ تو جناب اس سلسلے میں میرا خیال ہے کہ مایوسی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ بات کہتے ہوئے میرے ذہن میں کئی افسانوں کے عنوان اور افسانہ نگاروں کے نام آ رہے ہیں لیکن میں نام یوں نہیں لے رہا ہوں، میں چاہتا ہوں کہ ہم لوگ ناولوں اور افسانوں کے عنوانات میں نہ گھر جائیں اور کچھ اصولی باتیں کرلیں۔

آج کے افسانے کو زبان کے غیر مناسب استعمال کے لیے نکتہ چینی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے اور یہ نکتہ چینی بالکل بے بنیاد بھی نہیں ہے لیکن اس سلسلے میں یہ بات بھی ذہن نشیں رکھنی ہوگی کہ ان افسانہ نگاروں کی خاصی بڑی تعداد ایسے علاقوں سے متعلق ہے جو اردو کے علاقے نہیں ہیں۔ اور وہ افسانہ نگار جو اردو کے علاقوں کے رہنے والے ہیں زبان کی تعلیم میں پیش آنے والی رکاوٹوں اور معیار کی پستی کے شکار ہیں۔ اعتراض کرتے وقت ہمیں یہ بات بھی ذہن میں رکھنی ہوگی کہ ہمارا معاشرہ روز بروز غیر اردو ہوتا جا رہا ہے۔ کیا اس صورت حال کا اثر نہیں پڑ رہا ہے؟

آپ نے جن افسانہ نگاروں کے نام لیے ہیں، کرشن چندر اور بیدی وغیرہ وہ اردو میں اس صنف کے رہنماؤں میں تھے۔ پریم چند کا سروکار بنیادی طور پر دیہی زندگی سے تھا۔ یلدرم اور نیاز وغیرہ بالکل دوسرے طرح کے افسانے لکھتے تھے۔ چنانچہ جس طرح کے افسانے سے آج یا پچھلے ساٹھ ستر برسوں سے ہمارا معاملہ ہے ان کی صف اوّل کے لوگ تو یہی ہوئے نا۔ اس کے علاوہ ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات کو نئے پن کی کشش بھی حاصل تھی اس لیے آج کے افسانے کو ان افسانہ نگاروں کی تخلیقات کے برابر مقبولیت حاصل کرنے کے لیے بہت زیادہ نیا اور بہت زیادہ اچھا ہونا پڑے گا۔ آج کے افسانے کو اس پس منظر میں دیکھیے تو زیادہ مایوسی شاید نہ ہو۔

سوال: آپ انجمن ترقی پسند مصنفین سے بھی وابستہ تھے۔ کیا آپ کے خیال میں انجمن کی معنویت (Relevance) اب بھی باقی ہے؟

جواب: تنظیم کی نہیں، معنویت ان تصورات کی ہوتی ہے جو تنظیم کے ذریعے پیش کیے جاتے ہیں۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ان تصورات اور نظریات کا ایک بڑا حصہ اب بھی Relevant ہے۔ انجمن کی حیثیت اس وقت قطعاً ثانوی ہو جاتی ہے جب اس کے نظریات کو عام طور سے تسلیم کرلیا جائے۔ یہ صورت کم و بیش پچاس سال قبل ہی پیدا ہوگئی تھی اور اسی لیے انجمن کے دو بنیاد گزاروں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ اب انجمن کی ضرورت نہیں رہ گئی ہے۔ میں خود کو ان کی رائے سے متفق پاتا ہوں۔

سوال: ویسے بھی انجمن کا وجود اب برائے نام ہی رہ گیا ہے۔

جواب: دیکھیے ادبی انجمنوں کا اب دور ختم ہو چکا ہے۔ یہ صورت صرف اردو میں نہیں ہر زبان میں ہے۔ پھر بھی، انجمن قائم رہتی ہے تو کوئی ایسا نقصان نہیں۔ کبھی کبھی سال میں ایک آدھ بار، کچھ ہم خیال لوگ مل بیٹھتے ہیں، اس سے ادبی سرگرمیوں میں کچھ اضافہ ہی ہوتا ہے۔

سوال: ترقی پسند تحریک کے زوال کا سبب کیا تھا، بھیمڑی (بھونڈی) کانفرنس؟

جواب: بھیمڑی کانفرنس سے ترقی پسند تحریک کو یقیناً نقصان پہنچا لیکن اس کانفرنس سے قبل ہی انجمن سے متعلق مصنفین کے ایک بڑے حصے پر، خاص طور سے ان ادیبوں پر جن کا تعلق بمبئی سے تھا، انتہا پسندانہ خیالات چھائے ہوئے تھے۔ یہ کل سیاست اور ادب کی غیر ضروری قربت نے کھلایا تھا۔ پریم چند نے کہا تھا ادب سیاست سے آگے چلتا ہے، اس وقت بلکہ کئی برس پہلے سے ادب سر جھکائے، آنکھیں بند کیے سیاست کے پیچھے چلنے لگا تھا۔ بھیمڑی کانفرنس تو ان حالات کا نقطۂ عروج تھی۔

سوال: سجاد ظہیر پاکستان نہ جاتے تو شاید صورت حال مختلف ہوتی؟

جواب: شاید نہیں۔ خود سجاد ظہیر انتہا پسندی کا شکار ہوگئے تھے۔ پارٹی نے پاکستان جانے کے لیے جن دو تین لوگوں سے کہا تھا ان میں ڈاکٹر عبدالعلیم بھی تھے لیکن انھوں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ ہمیں دوسروں کے پھٹے میں پیر ڈالنے کے بجائے اپنا گھر درست کرنا چاہیے۔ انھوں نے بھیمڑی میں انتہا پسندی کی مخالفت بھی کی تھی۔ ایسی صورت میں سجاد ظہیر پاکستان نہ گئے ہوتے تو بھیمڑی میں کیا ہوتا اس کا فیصلہ میں آپ ہی پر چھوڑتا ہوں۔

سوال: عابد سہیل صاحب یہ بتائیے کہ انجمن ترقی پسند مصنفین، ترقی پسند تحریک یا ترقی پسند نظریات کی اردو ادب کو دین کیا ہے؟

جواب: ترقی پسند ادبی تحریک ادب کو ایک واضح سمت دینے کی ایک شعوری کوشش تھی۔ اس وقت عام طور سے ادب میں موضوع کو قابل لحاظ اہمیت نہیں دی جاتی تھی۔ شاعری میں زیادہ توجہ ردیف و قافیہ، زبان کی نزاکت و نفاست اور بات سے بات پیدا کرنے پر دی جاتی

تھی۔ صاف اور شفاف نثر بہت زیادہ پسند نہیں کی جاتی تھی۔ اور نام نہاد ''خوبصورت نثر'' کو مقصود سمجھا جاتا تھا، موضوع کو نہیں۔ ترقی پسند ادب نے موضوع کو اہمیت دی جس کے سبب تنقید کے وزن اور وقار میں اضافہ ہوا، رپورتاز کی ایک نئی صنف اردو میں وجود میں آئی، آزاد نظم کو اعتبار حاصل ہوا، علم اور ادب کے درمیان فاصلہ کم ہوا بلکہ علم ادب کا ہم رکاب بن گیا اور افسانے کی تو دنیا ہی بدل گئی۔

سوال: لیکن کہا جاتا ہے کہ ترقی پسندوں نے افسانے کو خاص طور سے فروغ دیا کیوں کہ یہ صنف ان کے کام کی تھی؟

جواب: یہ خیال جدیدیت کے چند حامیوں کا ہے اور غلط ہے۔ اصناف کو چند لوگوں کی کوششوں سے فروغ نہیں حاصل ہوتا بلکہ ان کا عروج ان کی ضرورت کے تابع ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو مثنوی اور قصیدے کا رواج آج بھی ہوتا۔ افسانے کو عروج اس لیے حاصل ہوا کہ اس کی ضرورت تھی۔

سوال: بعض لوگوں کا یہ بھی خیال تھا کہ افسانہ نثری نظم کے قریب آرہا ہے؟

جواب: افسوس کسی نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ کیا نثر میں فعل اپنی کارکردگی سے بری الذمہ ہوگیا ہے۔ بات حقیقت میں یہ ہے کہ افسانہ شاعری کے قریب اس وقت تک نہیں آسکتا جب تک نثر اس کے لیے تیار نہ ہو۔ ہوا بس یہ تھا کہ زندگی کی بے معنویت، لفظ میں معنی کی عدم موجودگی اور ترسیل کی ناکامی پر اصرار کے سبب جدیدیت کے زیر اثر تخلیق پانے والا ادب فکری سرمائے سے بالکل ہی محروم ہوگیا تھا۔ ایک مخصوص قسم کی شاعری میں چوں کہ خیال کو زیادہ اہمیت نہیں حاصل ہوئی اس لیے جدیدیت کے چند فلسفہ طرازوں کو یہ احساس ہوا کہ معنی سے عاری افسانہ شاعری کے قریب آرہا ہے۔ بعد میں آپ نے دیکھا کہ جدیدیت کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی افسانہ اپنی پرانی ڈگر پر لوٹ آیا۔

سوال: پرانی ڈگر پر لوٹ آنے سے آپ کی کیا مراد ہے؟

جواب: پرانی ڈگر سے مراد ہے کہانی اور بیانیہ کی طرف۔ علوم میں اضافہ اور زندگی کے تجربات کی گونا گونی میں زبردست وسعت کے سبب نثر کی اہمیت، ضرورت اور مقبولیت بڑھ رہی تھی۔ اس لیے افسانہ کوئی ایسی زبان قبول نہیں کر سکتا تھا جس میں فغاں کم اور انداز فغاں زیادہ ہو۔ فغاں کی اسی کمی اور انداز فغاں کی بہتات نے بھی جدیدیت کے زیر اثر لکھے جانے والے افسانے کے زوال کی راہ ہموار کی۔

سوال: آپ یہ تو نہیں کہنا چاہتے ہیں کہ آج کے افسانے نے ترقی پسندی کی ڈگر پکڑ لی ہے؟

جواب: ہرگز نہیں۔ لیکن دو ایک باتیں ضرور کہوں گا۔ ہم نظریے کے عہد میں سانس نہیں لے رہے ہیں۔ یہ اچھا ہے یا برا، یہ دوسری بات ہے۔ زندگی نے جو رخ اختیار کیا ہے اس میں کچھ دوسری چیزیں نشان منزل بن گئی ہیں۔ نظریہ اور یقین سے محرومی ایک المیہ بھی ہے۔ ان حالات میں کسی نظریے کو پوری طرح قابل قبول تسلیم نہ کرنے کے باوجود، تخلیق کو بے معنویت بننے سے محفوظ رکھ کر آج کا افسانہ نگار ایک بڑا کارنامہ انجام دے رہا ہے۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کے سامنے مقاصد تھے، آج کے افسانہ نگاروں کی متاع عزیز سروکار ہیں۔

سوال: آپ کی بنیادی شناخت بطور افسانہ نگار ہے۔ آپ کی پہلی تخلیق کب اور کہاں شائع ہوئی تھی؟

جواب: 1948 یا 1949 میں دیوان سنگھ مفتون کے ہفت روزہ ''ریاست'' کے خاص نمبر میں۔

سوال: اس نصف صدی سے زیادہ کے عرصے میں آپ کے صرف دو افسانوی مجموعے شائع ہوئے جن میں بمشکل تیس بتیس افسانے ہیں۔ اس کی وجہ کیا ہے؟

جواب: افسانے میں، دیگر اصناف کی طرح ایک چیز معیار بھی ہوتی ہے۔ زندہ رکھنے کے لیے تو ایک ہی نہایت عمدہ افسانہ کافی ہوتا ہے۔ پھر عرض کر دوں کہ اس دعوے کا تعلق میری افسانہ نگاری سے قطعاً نہیں ہے۔ اپنے افسانوں کی تعداد کے بارے میں یہ ضرور کہنا چاہوں گا کہ ہر افسانہ مجموعے میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔ مصنف کو اپنی تخلیقات کو مسترد کرنے کا بھی تو حق حاصل ہے۔ اس کی تحریریں نظر ثانی کا انتظار بھی کر سکتی ہیں۔

سوال: آپ اپنے افسانوں کی کس خوبی یا کس پہلو کو زیادہ قابل قدر سمجھتے ہیں؟

جواب: یہ میرا کام نہیں۔ میں اپنے افسانوں کے بارے میں بات نہیں کرتا۔

سوال: آپ کے خاکوں کے مجموعے ''کھلی کتاب'' نے خاصی مقبولیت حاصل کی ہے اور کئی خاکے تو بار بار چھاپے بھی جا رہے ہیں۔ ان کی اس کامیابی کا راز کیا ہے؟

جواب: راز اصل میں یہ ہے کہ جن لوگوں کے خاکے لکھے گئے ہیں ان میں

سے بیشتر اپنے وقت کے دیوزاد تھے لیکن انھوں نے اپنی شخصیتوں پر پردے ڈال رکھے تھے۔ یہ لوگ صفوں کے پیچھے رہ کر کام کرتے تھے اور نام ونمود سے بے نیاز تھے۔ میں نے بس یہ کیا ہے کہ ان کی شخصیتوں پر سے پردے اٹھائے ہیں۔ "کھلی کتاب" کے خاکوں میں کوئی خوبی ہے تو بس یہ کہ ان حضرات کی عظمت اور ان کی شخصیت کے حاوی پہلو سامنے آگئے ہیں۔ لیکن ایک افسوس بھی ہے۔ بعض خاکوں میں کم بیانی (Under Statement) سے کام لینا پڑا ہے۔ ڈر تھا کہ لِلی پٹ کے باسی گلیور کو تسلیم کرنے ہی سے انکار نہ کردیں۔

سوال: نیشنل بک ٹرسٹ نے آپ کا ایک ترجمہ حال ہی میں شائع کیا ہے، لئیق فتح علی کی کتاب اردو میں "باغات" کے نام سے۔ یہ آپ کا پہلا ترجمہ تو معلوم نہیں ہوتا؟

جواب: یہ بھی نہیں۔ ترجمے سے میرا پہلا معاملہ بنگالی کہانیوں کے ذریعے ہوا جو انگریزی میں تھیں۔ افسانوں کا یہ انتخاب دو جلدوں میں تھا۔ میں نے تین یا چار کہانیوں کا اردو میں ترجمہ اس وقت کیا تھا جب میں کرسچین کالج سے انٹرمیڈیٹ کررہا تھا۔ ان میں سے ایک ترجمہ پاکستان کے "ماہ نو" میں شائع ہوا تھا اور اس کا معاوضہ مجھے بذریعہ منی آرڈر ملا تھا۔ یعنی یہ بات 26 جنوری 1950 سے پہلے کی ہے۔ اس زمانے میں یا اس کے بعد موپاساں، چیخوف، کیتھرائن مینسفیلڈ اور گورکی وغیرہ کی چند کہانیوں کے ترجمے کیے تھے۔ یہ سارا کام شوقیہ تھا لیکن اس کے بعد چند کتابوں کے ترجمے کرنے پڑے۔ ان میں سے صرف ایک ترجمہ میرے نام سے شائع ہوا، باقی فرضی ناموں سے لیکن اب نہ ان کتابوں کے نام یاد ہیں نہ وہ نام جو بطور مترجم یا کسی اور صورت میں ان کتابوں کی زینت بنے تھے۔ اس کو ترجمہ کہنا بھی شاید مناسب نہ ہو۔ ہوتا بس یہ تھا کہ ناشر کی فراہم کی ہوئی جاسوسی یا مہماتی ناول کے مقامات، افراد کے نام ہندوستانی رکھ کر ڈھیلا ڈھالا ترجمہ کردیا جاتا۔

ایسے ہی ایک ناول کے سلسلے میں بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہوگئی۔ ناول میں چاروں طرف سے گھر جانے کے بعد ڈاکو پانی کے جہاز میں بیٹھ کر فرار ہوگئے تھے۔ میں نے مرکزی شہر کا نام لکھنؤ رکھا تھا۔ میں نے سوچا کہ نظر ثانی کے وقت ٹھیک کردوں گا اور اس وقت ڈاکوؤں کو گومتی سے فرار ہوجانے دیا لیکن نظر ثانی کی نوبت ہی نہیں آئی چند ماہ بعد کتابی دنیا کے مالک اظہر نگرامی مرحوم کو، جو اس کتاب کے ناشر تھے، ڈھاکہ سے ایک خط موصول ہوا جس میں لکھنؤ کی ترقی پر خوشی ظاہر کرتے ہوئے گومتی کے سمندر بن جانے پر مبارک باد دی گئی تھی۔ شاید یہ کتاب "سرخ انگلیاں" کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ بعد میں "قومی آواز" سے متعلق ہونے کے سبب ترجمے کی کچھ اور مشق ہوگئی۔

سوال: آپ کے زیر اشاعت افسانوی مجموعے کا نام کیا ہے؟

جواب: وہ تو میں بتادوں گا لیکن پہلے آپ یہ بتائیے کہ یہ انٹرویو کس رسالے میں شائع کرائیں گے؟

سوال: اسے "اردو دنیا" میں اشاعت کے لیے دینا چاہتا ہوں۔

جواب: "اردو دنیا" میں تو انٹرویو تواتر سے شائع ہوتے ہیں۔ یہ ماہنامہ عمدہ بھی ہے اور مقبول بھی۔ سبب اس کا یہ ہے کہ اس نے خود کو ادب تک محدود نہیں رکھا ہے اور اس میں زبان، تعلیم، تاریخ، صحافت، اور شخصیات وغیرہ پر بھی نہایت عمدہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ اس کا ناشر ادارہ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دوسرے کاموں کے علاوہ یہ کام بھی بڑے پیمانے پر اور نہایت عمدگی سے کررہی ہے۔

سوال: اس سلسلے میں کوئی مشورہ؟

جواب: مشورہ کیا؟ یہ خیال اکثر ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اردو کتابوں کی نکاسی کے راستے روز بروز مسدود ہوتے جارہے ہیں۔ اس سلسلے میں کونسل کو کچھ نہ کچھ ضرور کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں کافی باتیں ہوگئیں۔

سوال: لیکن آپ نے مجموعے کا نام تو بتایا نہیں؟

جواب: "غلام گردش"۔

سوال: ارادے، منصوبے؟

جواب: ہیں تو لیکن "سامان سو برس کا پل کی خبر نہیں" والا معاملہ ہے۔ بس یہ سمجھیے اب کام سمیٹ رہا ہوں۔

سوال: آپ کے مشہور ماہنامے "کتاب" کا تو نام بھی نہیں آیا۔

جواب: پھر کبھی سہی۔

□□□

H-3, Batla House
Jamia Nagar
New Delhi-110025

سید احسان الرحمٰن

فن ترجمہ نگاری: حدود اور امکانات

جو لوگ ترجمہ کرتے ہیں وہ جانتے ہیں کہ کوئی بھی زبان صرف افکار کا گہوارہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں زندگی کے دیگر تمام پہلو بھی بدرجۂ اتم موجود ہوتے ہیں۔ اس میں اس قوم کا مذہب، ثقافت، اس کی صنعتی اور سائنسی میدانوں کی ترقی، اس زبان کے بولنے والوں کی اخلاقیات اور ان کا تہذیبی معیار بھی شامل ہوتا ہے۔ زبان کے ذریعے اس قوم کے مجموعی مزاج اور اس کے مختلف فرقوں کے آپسی تعلقات کا پتہ چلتا ہے۔ یہ زبان ہی ہے جس سے اس قوم اور ملک کے احوال و ظروف کے بارے میں معلوم ہو سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی زبان کے سرمائے کو کسی دوسری زبان میں منتقل کیا جاتا ہے تو کچھ نہ کچھ نقصان کا اندیشہ ضرور رہتا ہے۔ اسی لیے ترجمے کو کسی نے انتقال معانی پر محمول کیا ہے تو کسی نے کہا ہے کہ ترجمہ کرتے وقت پہلی زبان کی خوبصورتی کو برقرار رکھنے پر بھی زور دینا چاہیے۔ کسی نے کہا ہے کہ ترجمہ ہو سکتا ہے، کیا جا سکتا ہے جب کہ کچھ اصرار کرتے ہیں کہ ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا اور خاص طور پر شعر کے ترجمہ کے بارے میں تو چند لوگوں نے سختی سے منع کیا ہے۔ اس میں عربی نقاد الجاحظ بھی شامل ہیں اور ایان فنلے بھی۔ ترجمے کے ضمن میں ہماری رائے تو یہ ہے کہ مترجم خواہ کتنا ہی تجربہ کار کیوں نہ ہو، دونوں زبانوں پر اس کی گرفت چاہے کتنی ہی مضبوط کیوں نہ ہو، جب وہ ترجمہ کرے گا تو کچھ نہ کچھ، کہیں نہ کہیں اسی کو ایڈجسٹمنٹ کرنا ہی ہوگا۔ جب ہم ایک کپ سے دوسرے کپ میں چائے انڈیلیں گے تو کچھ نہ کچھ تو زمین پر گرے گی ہی، ہماری پوری احتیاط کے باوجود۔ اس لیے معتد بہ علما اور ماہرین لسانیات کا یہ مشورہ ہے کہ ترجمہ کرتے وقت ہماری توجہ کا مرکز زیادہ تر وہ پیغام ہونا چاہیے جو اصل مؤلف عبارت کے ذریعے ہم تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اب یہ مقصد اور یہ منزل وہ کس طرح حاصل کرے گا، اصل زبان کی مشکلوں پر وہ کس طرح قابو پائے گا، دوسری زبان میں کس طرح وہ اصل پیغام کو پہنچا پائے گا، اس کی ذاتی مشکل بن کر رہ جاتا ہے۔ لیکن ہم ہر وقت اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ ترجمہ کرتے وقت مترجم کو امانت داری کا پورا پورا خیال رکھنا چاہیے۔ اس کو نہ صرف اس زبان میں محفوظ معانی اور مفاہیم کو دوسروں تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے بلکہ ہر اس چیز کو دوسروں تک پہنچانا چاہیے جو اس اصل متن میں ہے۔

یہ بات صحیح ہے کہ ہر زبان میں چند تعبیریں، مصطلحات اور ضرب الامثال ایسی ہوں گی جن کا ترجمہ کرنا ہر نقطۂ نظر سے ناممکن کے دائرے میں آتا ہوگا لیکن ایسی تعبیریں اور ضرب الامثال وغیرہ معدودے چند ہی ہوں گی اور یہیں مترجم کو تقاربی نظریے کو استعمال میں لانا ہوگا لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مترجم ایسے موقعوں پر یا تو معانی اور مفاہیم کی ٹھیک سے ادائیگی نہیں کر پاتا یا پھر اپنی تہذیب و ثقافت کو ان معانی اور مفاہیم پر حاوی کر دیتا ہے اور دونوں ہی صورتوں میں نقصان قاری کا ہوتا ہے جو ترجمے کے ذریعے دوسری تہذیب و ثقافت کو جاننا چاہتا ہے۔ ایسے حالات میں مترجم کو کیا کرنا چاہیے؟ اس کا بہتر طریقہ یہ ہے کہ ان کو قریب ترین مساوی معانی میں بیان کر کے اصل کو حاشیے میں دیا جائے اور اس کا سماجی اور ثقافتی پہلو واضح کیا جائے۔ میرے خیال میں یہ طریقہ صحیح ہے کیونکہ اس سے افکار کے ساتھ ساتھ ثقافتی پہلوؤں کا بھی لین دین ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اچھی تعبیریں بھی ہاتھ لگ جاتی ہیں۔ ایسی نئی چیزیں جو ہمارے ملک میں نہیں پائی جاتیں، ایسے نئے رشتے جو ہمارے یہاں نہیں ہوتے، ان کے نام ملتے ہیں، ان سے تعارف ہوتا ہے اور اپنی زبان کے دامن کو وسیع کرنے کا ایک موقع ملتا ہے۔ اسی لیے کسی بھی دوسری زبان سے اپنی زبان میں ترجمہ کرتے وقت اس کو اپنی زبان میں پوری طرح اتارنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ اس عمل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جا سکے۔ ترجمہ ایک بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ اصل تالیفی کام سے بھی کہیں زیادہ مشکل — کیونکہ تالیفی کام میں اپنے افکار کو اپنی زبان میں مقید کرنا ہوتا ہے جب کہ ترجمہ کرتے وقت افکار بھی دوسروں کے ہوتے ہیں اور جس زبان سے یا جس زبان میں ترجمہ کرتے ہیں وہ زبان بھی۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو ہمت ہارنا چاہیے اور نہ ہی دوسروں کو خوف زدہ کرنا چاہیے کہ ترجمہ کرتے وقت ہم کیا کر سکتے ہیں اور کیا نہیں کر سکتے۔ کسی بھی دی گئی زبان کے خصائص کو پوری طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ مثلاً اردو کے اس جملے "ذرا ادھر آؤ" کو پوری طرح عربی یا انگریزی یا کسی دوسری زبان میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ میرا خیال ہے کہ ایسا کرنا بہت ضروری بھی نہیں ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عربی زبان اختصار کی زبان ہے۔ اس میں وہ باتیں ایک لفظ میں کہی جا سکتی ہیں جن کی ادائیگی کے لیے کسی بھی دوسری زبان میں طول و طویل جملوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اس لیے

"ذھب" کی مثال دی جاتی ہے۔ جس کا مطلب ہے "وہ گیا یا وہ چلا گیا"۔ لیکن یہ دعویٰ صریحاً غلط ہے کیونکہ ہر زبان میں ایسے الفاظ موجود ہیں۔ ہر زبان میں کچھ الفاظ چند حرفی ہوتے ہیں مثلاً انگریزی میں "go" (آپ جائیے یا تم جاؤ۔) عرض مدعا یہ ہے کہ ان امور پر کوئی تنازعہ نہیں کھڑا کرنا چاہیے کہ یہ زبان زیادہ جامع ہے بہ نسبت اس زبان کے کیونکہ اس کے کبھی بھی خاطر خواہ نتائج نہیں نکل سکتے۔ ہر زبان جس میں ہم اپنے خیالات کا مکمل طور پر اظہار کرسکیں اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی ہوئی ضرورتوں کے اظہار کے لیے بخوبی استعمال کرسکیں وہ زبان مکمل ہوتی ہے، اتنی ہی مکمل جتنا کہ کوئی دوسری زبان ــــ اور اس طرح ہم جو بات ایک زبان میں کہہ سکتے ہیں یقیناً اس کو بخوبی دوسری زبان میں بھی کہہ سکتے ہیں بھلے ہی اسلوب بدل جائے، ترتیب بدل جائے، صیغہ بدل جائے یا پھر بلاغت میں تبدیلی آجائے۔ اگر کسی زبان میں کئی رشتوں کے لیے ایک لفظ ملتا ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ زبان نامکمل ہے۔ انگریزی میں Cousin (ماموں زاد، پھوپھی زاد، چچازاد، خالہ زاد بھائی یا بہن) کئی رشتوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عربی یا انگریزی یا کسی اور زبان میں رشتوں کے وہ نام نہ ملتے ہوں جو ہندی یا اردو میں ملتے ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہندی یا اردو دوسری زبانوں کے مقابلے میں 'ون پلس' ہوگی اور اس طرح ان کا ترجمہ مکمل طور پر انگریزی یا عربی یا کسی دوسری زبان میں نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کسی ایک زبان میں کسی ایک معنی میں استعمال شدہ لفظ صرف مفرد استعمال ہوتا ہے جب کہ اسی معنی کا لفظ کسی دوسری زبان میں جمع استعمال کرنا ضروری ہو یا جمع میں استعمال کرنے کا دستور ہو، تو اس طرح بھی کوئی زبان ناقص نہیں ہوسکتی اور اس طرح بھی ترجمے کی راہ میں کوئی رکاوٹ نہیں کھڑی ہوتی۔ مثال کے طور پر خبر اور نیوز (news) یا پھر عربی میں معدات اور انگریزی میں equipment یہ اور اسی طرح کے دوسرے فارمولوں کی بنیاد پر نہ تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ زبان زیادہ وسیع المعانی ہے یا پھر یہ کہ یہ معانی بھرپور طور پر فلاں زبان میں بیان نہیں کیے جاسکتے۔ شاید زبانوں کے انھی پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے چند زباندان ایڈجسٹمنٹ کی بات کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر الیگزینڈر فریزر (Alexander Fraser) اور لورڈ ووڈ ہاؤس لی (Lord Wood Housely) کا خیال ہے کہ حدود میں رہ کر مترجم ترجمہ کرتے وقت متن میں کمی بیشی کرسکتا ہے تاکہ بات کو کسی بھی دوسری زبان میں اچھی طرح سمجھا جاسکے۔ بعض ماہرین کا خیال ہے کہ ترجمہ اصل سے قریب بھی ہونا چاہیے اور دوسری زبان کے قواعد کی حدود میں بھی کیونکہ ترجمہ کرتے وقت یہ بات قطعاً ضروری نہیں ہے کہ ایک کے لیے ایک، کی تلاش کی جائے، کہنے کا مطلب یہ ہے کہ "فی یدہ کتاب" یا اس کے ہاتھ میں کتاب ہے کا ترجمہ In his hand (is) a book کرنا ضروری نہیں ہے اور نہ ہی موزوں۔ اس کو ہم انگریزی قواعد کے مطابق He holds a book کہہ سکتے ہیں۔ ہم تو نہیں سمجھتے کہ اس طرح معانی اور مفاہیم کا کسی طرح نقصان ہوا ہے۔ اگر ہم اپنی مادری زبان اردو پر نظر ڈالیں تو بھی انگریزی یا دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت سی ایسی مثالیں ملیں گی جن سے ہمارے اس مفروضے کی تائید ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر معلومات ہمیشہ جمع کے صیغہ میں ہی استعمال ہوتا ہے جب کہ انگریزی میں information مفرد استعمال ہوتا ہے۔

ایک اور اہم بات یا خوبی جو مترجم میں ہونا ضروری ہے وہ یہ ہے کہ زبان پر گرفت کے ساتھ ساتھ اس کی اس موضوع پر بھی گرفت مضبوط ہونی چاہیے یا پھر کم از کم وہ موضوع اس کی سمجھ میں آنا چاہیے جس کا وہ ترجمہ کررہا ہے۔ مثال کے طور پر اگر اس کو قانونی دستاویز کا ترجمہ کرنا ہے تو قانونی مصطلحات اس کی سمجھ میں آنی چاہئیں۔ یہ تو ضروری نہیں ہے کہ وہ ماہر قانون ہو لیکن اگر ایسا ہوسکے تو اس سے اچھی کوئی بات نہیں ہے۔ اس طرح الجاحظ کی شرطوں کی تکمیل کی جاسکے گی لیکن اکثر و بیشتر ایسا ہوتا نہیں اور نہ ہی کم از کم ہندوستانی سیاق میں ایسا ہوسکتا ہے جہاں ترجمے کو سب سے آسان کام سمجھا جاتا ہے ــــ ایک زبان میں لکھی ہوئی عبارت دماغ کی مشین سے نکلی ہوئی فوٹو اسٹیٹ کاپی۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ترجمہ اصل سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اس کے لیے ضروری یہ بھی ہے کہ ایک ماہر اور پیشہ ور مترجم دونوں زبانوں میں پڑھنا جاری رکھے۔ ہر موضوع پر پڑھنے کے ساتھ ساتھ اس غیر ملکی زبان میں فلمیں دیکھنا بھی اس کے مشغلے میں شامل ہونا چاہیے۔

راقم السطور نے موجودہ عربی زبان کی دستاویزات میں اکثر فرانسیسی، اطالوی اور انگریزی وغیرہ کے الفاظ، خاص طور پر تجارتی کاغذات (Business Documents) اور ٹھیکوں (Tenders) وغیرہ میں استعمال ہوتے دیکھے ہیں۔ اس بات کے مدنظر میرا خیال ہے کہ مترجم کو عالمی سطح پر استعمال کی جانے والی زبانوں کی بھی شدبد ہونی چاہیے، خاص طور پر ان عالمی زبانوں کی ابتدائی تعلیم حاصل کرنی چاہیے جن میں آئے دن صنعتی اور سائنسی مواد ہمارے سامنے آتا رہتا ہے۔

ایک اہم بات جس کا ذکر نہایت ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اکثر شکی مزاج لوگ ایک شخص سے ترجمہ کرانے کے بعد اس کو کسی دوسرے شخص سے رائے لینے کے لیے پیش کرتے ہیں جس کو اصطلاحی زبان میں Vetting یعنی

تدقیق نظر کہا جاتا ہے، ایسا کرنا بری بات تو نہیں ہے لیکن اکثر بے ڈھنگے لوگ بے ڈھنگے طریقے سے Vetting کرتے ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ شروع میں ہی ایک اچھا اور قابل اعتماد مترجم تلاش کر لینا چاہیے اور اس پر اعتماد کر کے ترجمہ کرانا چاہیے اور اس کے کام کی قدر کرنی چاہیے۔ ایسا نہ کرنے کی صورت میں اکثر پریشانی پیدا ہو سکتی ہے۔ ترجمہ ایک ایسا عمل ہے جس کو ہر زبانداں اس بلندی سے انجام دیتا ہے جہاں وہ کھڑا ہوتا ہے۔ ہر زبانداں اچھے سے اچھے ترجمے کی اصلاح کر سکتا ہے (یہاں ترجمے کے سلسلے میں اچھے ترجمہ سے مراد صحیح ترجمہ ہے)۔ آپ کسی کے بھی ترجمے کو اصلاح کے لیے دیجیے اس میں یقیناً ''اصلاح'' کی گنجائش موجود ہوگی۔ حتیٰ کہ اصلاح شدہ ترجمے میں اصلاح کی گنجائش باقی رہتی ہے۔ یہاں اس بات کو ایک عام اور شاید سوقیانہ ضرب المثل کے ذریعے زیادہ اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ ''غریب کی جورو سب کی بھابی'' اور نتیجتاً جو بھی آتا ہے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتا ہے۔ اگر ہم زبانداں میں بیکاری اور بددیانتی کو ذہن میں رکھیں تو ان کی اس مجبوری کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

اگر ہم اپنی مادری زبان اردو پر نظر ڈالیں تو بھی انگریزی یا دوسری زبانوں کے مقابلے میں بہت سی ایسی مثالیں ملیں گی جن سے ہمارے اس مفروضہ کی تائید ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر معلومات ہمیشہ جمع کے صیغہ میں ہی استعمال ہوتا ہے جب کہ انگریزی میں Information مفرد استعمال ہوتا ہے۔

□□□

Chairperson
Centre of Arabic & African Studies
JNU, New Delhi-110067

شعر، غیر شعر اور نثر

مصنف: شمس الرحمن فاروقی

جناب شمس الرحمن فاروقی کے خیال انگیز مضامین کا یہ مجموعہ پہلی بار 1973 اور دوسری بار 1998 میں شائع ہوا تھا۔ اس میں شامل مضامین نے تفہیم شعر و ادب کی نئی راہیں کھولیں۔ یہ اس اہم کتاب کا تازہ ترین ایڈیشن ہے جس میں ''پس نوشت: آج یہ کتاب'' کے عنوان سے ایک نئے مضمون کا اضافہ بھی کر دیا گیا ہے۔ جدید ادب اور جدیدیت کی تفہیم نیز کلاسیکی ادب کی فہم و بازیافت دونوں کے لیے اس کتاب کا مطالعہ ضروری ہے۔

صفحات: 528، قیمت -/228 روپے

کلیات مصحفی (جلد اول تا چہارم)

مرتبہ: نثار احمد فاروقی

غلام ہمدانی مصحفی کا وطن امروہہ تھا لیکن ان کی زندگی کا بیشتر حصہ دہلی اور لکھنؤ میں گزرا اور ان دونوں بڑے ادبی مراکز سے کسب فیض کر کے انھوں نے ایک نیا رنگ سخن ایجاد کیا جو ان کی پہچان بنا۔ مصحفی بڑے پرگو شاعر تھے۔ جناب نثار احمد فاروقی نے جو مصحفی کے ہم وطن بھی تھے ان کی کلیات آٹھ جلدوں میں مرتب کر دیا ہے، جن میں سے چار شائع ہو چکے ہیں۔

جلد اول۔ صفحات: 495، قیمت: -/220
جلد دوم۔ صفحات: 369، قیمت: -/154
جلد سوم۔ صفحات: 320، قیمت: -/181
جلد چہارم۔ صفحات: 389، قیمت: -/216

توبتہ النصوح

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

''توبتہ النصوح'' اردو کے پہلے ناول نگار ڈپٹی نذیر احمد کا تیسرا ناول ہے جو پہلی بار 1877 میں شائع ہوا۔ اصلاح معاشرہ کے مقصد سے لکھے گئے اس ناول کو کلاسک کا درجہ حاصل ہے اور یہ ملک کی تمام یونیورسٹیوں اور کالجوں کے نصاب میں شامل ہے۔ ناول کا یہ ایڈیشن اتر پردیش اردو اکادمی کے 1983 میں شائع کردہ نسخے پر مبنی ہے۔

صفحات: 175، قیمت: -/75 روپے

ابن الوقت

مصنف: ڈپٹی نذیر احمد

ڈپٹی نذیر احمد نے اس ناول میں انگریزی تہذیب کی اندھی تقلید اور اس سے پیدا ہونے والی خرابیوں کو موضوع بنایا ہے۔ ابن الوقت، نوبل صاحب اور حجتہ الاسلام کے کرداروں کی مدد سے ناول نگار نے انیسویں صدی کے ہندوستانی مسلم معاشرے کی عکاسی کی ہے جو اس عبوری دور سے گزر رہا تھا۔ ناول کا متن اتر پردیش اردو اکادمی کے 1973 میں شائع کردہ متن پر مبنی ہے۔

صفحات: 225، قیمت: -/91 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجران کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110066

کے. پی. شمس الدین

کیرالا میں اردو تعلیم

(اسکولی سطح پر)

ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں کیرالا جیسی غیر اردو ریاست میں اردو کے لیے نسبتاً سازگار ماحول رہا ہے۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ کیرالا میں لاکھوں کی تعداد میں طلبہ اسکولوں میں اردو تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں اردو اساتذہ تدریسی فرائض ادا کر رہے ہیں۔ کیرالا میں آزادی سے قبل ہی اسکولی سطح پر اردو کی تعلیم شروع ہو چکی تھی اور اردو کی تعلیم کی جڑیں مضبوط ہو رہی تھیں کہ ملک کو تقسیم سے دوچار ہونا پڑا۔ 1947 کے بعد دیگر ریاستوں کی طرح کیرالا میں بھی اردو کو برتر حالات کا سامنا کرنا پڑا اور اس صورت حال میں یہاں اردو کو شک کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔

آزادی کے بعد کیرالہ میں گنتی کے چند اسکولوں میں اردو کی تعلیم دی جاتی تھی۔ کالی کٹ کے جے.ڈی.ٹی. اسلام ہائی اسکول، تلشیری کے بی.ای.ایم. ہائی اسکول، مبارک ہائی اسکول، سینٹ جوزف ہائی اسکول، کوچین کے حاجی عیسیٰ حاجی موسیٰ ہائی اسکول اور کاسرکوڈ کے ہندوستانی اسکول میں اردو تعلیم کی سہولت تھی۔ کنور کے میونسپل ہائی اسکول میں بھی اردو تعلیم کی سہولت تھی لیکن وہاں کے اردو معلم ابوبکر منشی فاضل کے اچانک انتقال کے بعد وہاں اردو کی اسامی اس وجہ سے ہندی بھی بدل دی گئی کہ پورے کیرالا میں اس وقت اردو کا کوئی سند یافتہ موجود نہ تھا۔ یہی حال کاسرکوڈ مسلم ہائی اسکول کا بھی ہوا۔ وہاں کے معلم کے سبک دوش ہونے کے بعد اردو خاتمہ ہو گیا۔

اردو تعلیم اسکولی سطح پر عام کرنے کے لیے سید محمد سرور، ولا پتنم عبداللہ، اتحق محمد فقیر جیسی شخصیتوں نے بڑی محنت کی اور اردو کی بقا اور فروغ کے لیے تحریکیں چلائیں۔ 1958 میں سرور صاحب اور ان کے رفقا نے انجمن اردو اشاعت قائم کی۔ 1962 میں ولا پتنم عبداللہ نے "اردو پرچار سبھا" کی بنیاد ڈالی۔ 1970 میں اتحق محمد فقیر نے انجمن اصلاح اللسان کی تشکیل نو کی۔ 1972 میں کے.پی.سی. بیرانے اردو پرچار سمیتی، قائم کی۔ ان تمام انجمنوں نے مشترکہ محاذ بنا کر حکومت سے اردو تعلیم کو عام کرنے کا مطالبہ کیا اور اسکولوں میں اردو تعلیم کی سہولت کے لیے مسلسل تحریکیں چلائیں۔

1968 میں یہاں عام انتخابات ہوئے۔ جب حکومت بنی تو اس میں مسلم لیگ بھی شریک رہی۔ مسلم لیگ کے دو وزرا احمد کری کل اور سی.ایچ.محمد کویا کابینہ میں تھے۔ وزیر تعلیم کا قلمدان سی.ایچ.محمد کویا کے ہاتھوں میں تھا۔ سید محمد سرور اور احمد کری کل کے قریبی مراسم تھے۔ احمد کری کل کے وزیر بننے پر... صاحب نے تروننت پورم جا کر احمد کری کل سے اردو زبان اور تعلیم کی بقا اور فروغ کے لیے کوششیں کرنے کی درخواست کی۔

احمد کری کل اور سی.ایچ.محمد کویا نے اس معاملے پر سنجیدگی سے غور کر کے اردو لوور اور ہائر امتحانات کا اعلان کیا اور سرکاری فرمان جاری کرایا۔ اس کے لیے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی۔

وزارت کی طرف سے اردو امتحانوں کے لیے تشکیل دی گئی۔ اس سہ رکنی نصابی کمیٹی میں خود سرور صاحب، برنن کالج کے اردو استاد شاکر صاحب اور فاروق کالج کے محمد ابراہیم صاحب شامل تھے۔ اس کمیٹی کے تیار کردہ نصاب کے مطابق اردو لوور اور ہائیر امتحانات کا آغاز ہوا۔ کافی تعداد میں نوجوانوں نے ان میں شریک ہو کر کامیابی حاصل کی۔

اسکولوں میں اردو تعلیم کے لیے تحریک مسلسل جاری رہی جس کے نتیجے میں 37-1972 میں کئی سرکاری، نیم سرکاری (امدادی) اسکولوں میں اردو کی تعلیم شروع ہوئی۔ پانچویں جماعت میں اختیاری مضمون کی حیثیت سے اردو پڑھنے والے طلبہ کی تعداد اگر پچاس ہے تو ایک اردو معلم کا تقرر کرنے کی اجازت تھی۔ بعد میں یہ تیس طلبہ کے لیے کر دی گئیں۔ اس وقت ایک اردو معلم کی اسامی کے لیے صرف بارہ طلبہ کافی ہیں۔ یہاں اردو معلم کو بھی دیگر اساتذہ کے برابر حکومت سے تنخواہ ملتی ہے۔ پبلک سروس کمیشن کے ذریعے اردو اساتذہ کا تقرر ہوتا ہے۔

اردو اساتذہ کے مسائل اور پریشانیوں کو دور کرنے اور حل کرنے کے لیے سید محمد سرور، اتحق محمد فقیر، کے.پی.سی. بیران جیسے لوگوں کی کاوشوں سے "کیرالا اردو ٹیچرس اسوسی ایشن" کا قیام عمل میں آیا۔ اسکولی سطح پر اردو زبان ترقی کے ساتھ ساتھ اسکولوں میں کئی طرح کے مسائل بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ مادری زبان کے طور پر ملیالم استعمال کرنے والے طلبہ کو ہی نہیں بلکہ اساتذہ کو بھی مادری زبان اردو نہ ہونے کی وجہ سے کئی مسائل درپیش ہونے لگے۔ کسی بھی زبان سے ہو بہو ترجمہ کر کے بولنے پر زبان کی ساخت بگڑتی ہی ہے بعض اوقات مفہوم بھی بدل جاتا ہے۔ ملیالی طلبہ کو اردو سکھانے میں یہی

خاص دشواری پیش آتی تھی۔ مثال کے طور پر اردو میں دوستوں سے خوشی کے موقع پر کہتے تک "چلیے بھئی اس بات پر چائے پلایئے" یا "شربت پلایئے"، "منہ میٹھا کرایئے"، اس بات کو ملیالم میں "چائے خرید کر دیجیے" یا مٹھائی خرید کر دیجیے" یا کہتے ہیں زبان کی ساخت یا بول چال کی زبان سے ناواقف اساتذہ ملیالم والی بات ہی اردو میں ترجمہ کر کے کہتے ہیں اور زبان کیا سے کیا ہو جاتی ہے۔

کیرالا کے اسکولوں میں جس زمانے میں اردو تعلیم کا آغاز ہوا اس وقت ریاستی تعلیمی بورڈ کی ترتیب دی ہوئی کوئی اردو درسی کتاب موجود نہیں تھی۔ کیرالا میں آندھرا پردیش اور تمل ناڈو کی اردو درسی کتابیں پڑھائی جاتی تھیں۔ آندھرا پردیش یا تمل ناڈو کی پہلی سے پانچویں تک کی کتابیں کیرالا میں پانچویں سے دسویں تک پڑھائی جاتی تھی۔ اس وجہ سے بھی اساتذہ اور طلبہ کو کافی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا تھا کیوں کہ یہ درسی کتابیں اردو مادری زبان والوں کے لیے تیار کی گئی تھیں۔ 1980 کے بعد کیرالا میں اردو درسی کتابیں تیار کی جانے لگیں۔ اس وقت مسئلہ یہ تھا کہ کیرالا میں اردو کا کوئی ماہر لسانیات نہ تھا۔ اس لیے دوسری ریاستوں سے ماہرین زبان و تعلیم کو مدعو کیا جاتا تھا۔ کیرالا میں پہلی مرتبہ آندھرا پردیش اردو اکادمی کی نگرانی میں اردو درسی کتابیں تیار کی گئی تھیں۔ 1985 کے بعد ہر پانچ سال پر یہاں کتابیں تبدیل کی جاتی ہیں۔ اس کی ذمہ داری کیرالا کے ایس.سی.ای.آر.ٹی. (SCERT) پر ہے جو کہ پہلے ایس.آئی.ای. (اسٹیٹ انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن) کے نام سے جانا جاتا تھا۔ ایس.سی.ای.آر.ٹی. کے اردو ریسرچ آفیسر کے زیر نگرانی اردو کے ماہرین اساتذہ کا انتخاب کر کے ورکشاپ منعقد کیا جاتا ہے۔ مسلسل گفت و شنید اور بحث و مباحثے اور ورکشاپ منعقد کرنے کے بعد درسی کتاب تیار کی جاتی ہے۔ اس طرح کے ورکشاپوں کی نگرانی کے لیے ملک کے مختلف ماہرین لسانیات کی خدمات حاصل کی جاتی ہیں۔

کیرالا کی تہذیب و ثقافت اور تمدن کو مدنظر رکھتے ہوئے درسی کتابیں تیار کرنے پر کچھ حد تک پریشانی ختم ہوئی لیکن محض کتابیں تیار کر لینے سے تمام مسائل کا حل ممکن نہیں ہے۔ طلبہ کو عملی طور پر اس کا درس دینے کا مسئلہ ہنوز برقرار رہا۔

اس کے لیے بھی ایس.سی.ای.آر.ٹی. اور ڈی.پی.آئی. (ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن) نے اساتذہ کے لیے اِن سروس کورس شروع کیے۔ ان کورسوں میں غیر اردو داں طلبہ کے سامنے اسباق پیش کرنے کا طریقہ بتایا جاتا ہے۔ ٹیچر ٹریننگ کورس سے اساتذہ کو بے حد فائدہ پہنچا اور کافی حد تک اساتذہ جو اپنے آپ کو غیر اردو داں سمجھتے تھے اس احساس کمتری سے آزاد ہونے لگے۔

اس وقت کیرالا میں اسکولی سطح پر اردو تعلیم کی جڑ کافی مضبوط ہو چکی ہے۔ کیرالا کے اسکولوں میں (پہلی سے دسویں جماعت تک) سے اسکولوں میں (اپر پرائمری اور ہائی اسکول) اردو کی تعلیم بھی دی جا رہی ہے اور پرائمری سطح پر ایک اسکول، اپر پرائمری سطح پر 1261 اسکول، اور ہائی اسکول سطح پر 377 اسکولوں میں اردو پہلی زبان (First language) کی حیثیت سے پڑھائی جا رہی ہے۔ (ان میں پرائمری سے منسلک ہائی اسکولوں کی تعداد 184 ہے) یہاں ترونند پورم اور پتنم تتھا ضلعوں کے علاوہ باقی بارہ اضلاع میں اردو اسکولی سطح پر پڑھائی جا رہی ہے۔ سب سے زیادہ ضلع پرم اور کالی کٹ میں طلبہ اردو پڑھتے ہیں۔ پوری ریاست میں پانچویں سے دسویں تک اردو پڑھنے والے کل طلبہ کی تعداد 1,10,186 ہے اور اردو پڑھانے والے اساتذہ کی تعداد 1637 ہے۔ ان کے علاوہ تقریباً 100 ایسے اردو کے اساتذہ بھی ہیں جو عارضی طور پر تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ یہاں کے اردو اساتذہ میں چالیس فی صد ایسے اساتذہ غیر مسلم ہیں۔ کیرالا کے اسکولوں میں اردو تعلیم کی صورت حال ضلعی سطح پر ملاحظہ کیجیے۔

ترونند پورم:

کل اسکول (پہلی سے دسویں تک): 896

اردو تعلیم کی سہولت والے اسکولوں کی تعداد: ایک بھی نہیں

کولم:

کل اسکول (پہلی سے دسویں جماعت تک): 861

اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 11

اپر پرائمری سطح پر اردو تعلیم والے اسکول: 9

ہائی اسکول سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 2

(ان میں دو ہائی اسکول اپر پرائمری سے ملحق ہیں)

اردو پڑھنے والے کل طلبہ کی تعداد: 358

اردو اساتذہ کی تعداد: 11

پتنم تتھا:

کل اسکول (پہلی سے دسویں جماعت تک): 696

اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: ایک بھی نہیں

آلاپژہ:

کل اسکول (پہلی سے دسویں جماعت تک): 722

اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 3

اپر پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 1

ہائی اسکول سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 2
(ان میں ایک ہائی اسکول اپر پرائمری سے ملحق)
اردو پڑھنے والے کل طلبہ: 102، اردو اساتذہ: 3

کوٹایم:

کل اسکول (پہلی سے دسویں جماعت تک): 857
اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 6
اپر پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 5
ہائی اسکول سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 1
(ان میں ایک ہائی اسکول اپر پرائمری سے ملحقہ ہے)
اردو پڑھنے والے کل طلبہ: 386
اردو اساتذہ کی تعداد: 6

اڈکی:

کل اسکول (پہلی سے دسویں جماعت تک): 453
اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 2
اپر پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 2
اردو پڑھنے والے کل طلبہ کی تعداد: 78
اردو اساتذہ کی تعداد: 2

ایناکلم:

کل اسکول (پہلی سے دسویں جماعت تک): 910
اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 8
اپر پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 6
ہائی اسکول سطح پر اردوف تعلیم کی سہولت والے اسکول: 2
(ان میں اپر پرائمری سے ملحق اسکولوں کی تعداد دو ہے)
اردو پڑھنے والے کل طلبہ: 468
اردو اساتذہ کی تعداد: 8

ترشور:

کل اسکول (پہلی سے دسویں جماعت تک): 925
اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 143
اپر پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 111
ہائی اسکول سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 45
(ان میں گیارہ ہائی اسکول اپر پرائمری سے ملحقہ ہیں)
اردو پڑھنے والے کل طلبہ: 3624
اردو اساتذہ کی تعداد: 155

پالاکاڈ:

کل اسکول (پہلی سے دسویں جماعت تک): 903
اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 194
اپر پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 158
ہائی اسکول سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 43
(ان میں سے پانچ ہائی اسکول اپر پرائمری سے ملحق ہیں)
اردو پڑھنے والے کل طلبہ: 8143
اردو اساتذہ کی تعداد: 201

ملاپرم:

کل اسکول (پہلی سے دسویں جماعت تک): 1328
اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 468
اپر پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 346
ہائی اسکول سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 138
(ان میں ایک سو چوبیس ہائی اسکول اپر پرائمری سے ملحق ہیں)
اردو پڑھنے والے کل طلبہ: 56236
اردو اساتذہ کی تعداد: 483

کالی کٹ (کوزی کوڈ)

کل اسکول پہلی سے دسویں جماعت تک: 1198
اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 280
اپر پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 223
ہائی اسکول سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 64
(ان میں بارہ ہائی اسکول پرائمری سے ملحق ہیں)
اردو پڑھنے والے کل طلبا: 14563
اردو اساتذہ کی تعداد: 287

وائے ناڈ:

کل اسکول (پہلی سے دسویں جماعت تک): 272
اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 72
اپر پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 61
ہائی اسکول سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 14
(ان میں پانچ ہائی اسکول پرائمری سے ملحق ہیں)
اردو پڑھنے والے کل طلبہ: 4342
اردو اساتذہ کی تعداد: 75

کلور:

کل اسکول (پہلی سے دسویں جماعت تک): 1240
اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 316
اپر پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 277
ہائی اسکول سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 53
(ان میں چودہ ہائی اسکول پرائمری سے ملحق ہیں)
اردو پڑھنے والے کل طلبہ: 16726
اردو اساتذہ کی تعداد: 330

کاسرکوڈ:

کل اسکول (پہلی سے دسویں جماعت تک): 507
اردو تعلیم کی سہولت والے کل اسکول: 74
اپر پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 62
پرائمری سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 1
ہائی اسکول سطح پر اردو تعلیم کی سہولت والے اسکول: 13
(ان میں سات ہائی اسکول اپر پرائمری سے ملحق ہیں) اردو پڑھنے والے کل طلبہ: 5164
اردو اساتذہ کی تعداد: 76

کیرالا میں غیر سرکاری یا غیر امدادی اسکولوں کی کل تعداد 531 ہے جن میں آٹھ اسکول ایسے ہیں جہاں اردو کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ ایسے نجی اسکولوں کے اساتذہ کا حکومت سے کوئی سروکار نہیں ہوتا ہے۔ ان کی تنخواہ بھی انتظامیہ کے ذمے ہوتی ہے۔

کیرالا میں تعلیمی سال 06-2005 میں دسویں جماعت کے امتحان میں شرکت کرنے والے طلبہ کی کل تعداد 5,36,953 ہے۔

ان میں بارہ ہزار دو سو اکتیس (12231) طلبہ ایسے ہیں جو first language کی حیثیت سے اردو پڑھتے ہیں۔ اردو تدریس کے سلسلے میں پیش آنے والی دقتوں کو دور کرنے کے لیے ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کیرالا نے ہر جماعت کی درسی کتاب کے ساتھ ساتھ رہنما کتاب (Teacher's Hand Book) بھی شائع کی ہے۔ ہینڈ بک سے کچھ حد تک تو پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں لیکن ایک کمی رہ جاتی ہے وہ ہے ماحول۔ کیرالا کے اردو اساتذہ کے لیے اردو علاقوں میں تربیتی کورس منعقد کیا جائے تو بلاشبہ یہ بے حد فائدہ مند ثابت ہوگا۔ اردو ماحول سے زیادہ بہتر طریقے سے تدریسی خدمات ادا کر سکیں گے۔

اردو زبان سے دلچسپی میں اضافہ کرنے کے لیے مشاعرہ، قوالی، غزل وغیرہ کے پروگرام منعقد کرنا چاہیے۔ کیرالا میں اردو اخبار یا رسالے کی کمی بھی طلبہ اور اساتذہ کو کھٹکتی ہے۔ کیرالا اردو ٹیچرس اسوسی ایشن، کا ترجمان سہ ماہی ''اردو بلیٹن'' ضرور شائع ہوتا ہے لیکن یہ ستر فی صد ملیالم اور تیس فی صد اردو زبان میں ہوتا ہے۔ ایس۔سی۔ای۔آر۔ٹی۔ کیرالا کے اردو ریسرچ آفیسر این۔ محی الدین کٹی کے زیرِ نگرانی منعقد کردہ ٹریننگ کورسوں میں اردو قلمی جریدے بھی تیار کیے جاتے ہیں جس سے بھی اساتذہ کو کافی فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن یہ بہت محدود پیمانے پر ہے۔ کیرالا میں اگر اردو اکادمی قائم کی جائے تو کچھ حد تک مذکورہ مسائل کا حل نکل سکتا ہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ حکومت کیرالا نے اردو اکادمی قائم کرنے کے لیے پیش رفت شروع کر دی ہے۔ اس سلسلے میں وزیرِ تعلیم ای۔ٹی۔ محمد بشیر کیرالا اردو ٹیچرس اسوسی ایشن اور انجمن ترقی اردو کیرالہ کے کارکنان (ٹی۔ محمد، احمد کٹی کلاتل، کے۔ شوکت علی، این۔ محی الدین کٹی، عبدالرحمٰن کٹی، کے۔ پی۔ شمس الدین) سے گفت و شنید کر کے ایک سہ رکنی ٹاسک فورس (ڈاکٹر ایم سلیمان مولوی، این۔ محی الدین کٹی، ٹی۔ محمد) تشکیل دی گئی اور جلد از جلد حکومت اکادمی سے متعلق رپورٹ پیش کرنے کے لیے کہا گیا۔ سہ رکنی کمیٹی نے حکومت کو رپورٹ پیش کر دی ہے۔ اب محبانِ اردو ''اردو اکادمی'' کے اعلان کے منتظر ہیں۔

کیرالا اردو ٹیچرس اسوسی ایشن کے ساتھ ساتھ انجمن ترقی اردو (کیرالا) بھی اردو تعلیم کی ترقی و ترویج کے لیے مسلسل کام کر رہی ہے۔ انجمن کے صدر نشین ایم۔ پی۔ عبدالصمد صمدانی کی کاوشوں سے کیرالا میں اردو کا شوق و ذوق کافی بڑھا ہے۔

اردو اساتذہ کے لیے کیرالا اردو ٹیچرس اسوسی ایشن ''انجمن ترقی اردو'' ریاستی کونسل برائے تعلیم و تربیت، ڈائرکٹر آف پبلک انسٹرکشن، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ہندوستانی زبانوں کا مرکزی ادارہ (Central Institute of Indian Languages)، اردو تدریس اور تحقیقی مرکز، یونیورسٹی گرانٹ کمیشن جیسے ادارے وقتاً فوقتاً سمینار اور تربیتی کورس منعقد کرتے رہتے ہیں۔ اس سے اساتذہ کو کافی حد تک فائدہ پہنچا ہے اور طلبہ بھی ان سے مستفید ہوتے ہیں۔ مذکورہ ادارے کیرالا میں اگر مزید ادبی اور تعلیمی پروگرام منعقد کریں تو بلاشبہ اساتذہ کو بھی فائدہ ہوگا اور اس کے ساتھ ساتھ طلبہ بھی اردو تعلیم حاصل کرنے میں زیادہ سے زیادہ دلچسپی لیں گے۔

□□□

Urdu Teacher
A.M.High School
P.O.Tirurkad, Malappuram (Distt.)
KERALA-679351

عبدالودود انصاری

اردو معلموں کی تربیت کا مسئلہ

(مغربی بنگال کے حوالے سے)

مغربی بنگال میں کئی یونیورسٹیاں ہیں جن کے تحت سینتالیس (47) بی۔ایڈ کالج ہیں جہاں تدریسی تربیت دی جاتی ہے اور زیر تربیت معلم فلسفۂ تعلیم، بچوں کی نفسیات، درسگاہوں کی تنظیم اور درس و تدریس کے طریقۂ کار اور نئی تکنیکوں سے واقفیت حاصل کرتے ہیں اور فن تدریس میں کمال حاصل کرتے ہیں۔

مغربی بنگال میں کلکتہ یونیورسٹی ہی وہ واحد یونیورسٹی ہے جہاں ایم۔اے۔(اردو) اور ایم۔اے۔(فارسی) کی تعلیم دی جاتی ہے اور ریاست کے چند کالجوں میں اردو آنرز اور فارسی آنرز کی سہولت فراہم ہے۔ جب کوئی طالب علم ایم۔اے۔ (اردو) یا ایم۔اے۔ (فارسی) یا ان دونوں مضامین میں آنرز کی تعلیم مکمل کر کے معلمی کا پیشہ اختیار کرنے کا فیصلہ کرتا ہے تو بی۔ایڈ/بی۔ٹی۔ میں داخلے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ بی۔ ایڈ میں دو مضامین بطور Method Papers لازمی طور پر اختیار کرنا پڑتا ہے۔ مغربی بنگال میں بی۔ایڈ کالج سریشہ واحد کالج ہے جہاں اردو اور عربی بطور Method Papers کی سہولت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اردو یا فارسی کا طالب علم اردو یا فارسی کی تدریس کی تربیت کہاں حاصل کرتے؟ کبھی کبھی یا اکثر صورت حال یہ ہوتی ہے کہ ایم۔اے۔ (اردو) یا ایم۔اے۔ (فارسی) کے طالب علم کو بی۔ایڈ کالجوں میں داخلے کا فارم یہ کہہ کر نہیں دیا جاتا کہ کالج میں بطور Method Papers اردو یا فارسی نہیں ہے۔ یہ دشواری تو نئے طالب علموں کے ساتھ ہوتی ہے جب کہ سرکاری اساتذہ جنھیں حکومت تنخواہ کے ساتھ بی۔ایڈ کرنے کے لیے بھیجتی ہے انھیں بھی اردو یا فارسی مضامین کی عدم موجودگی میں ایسے مضامین کا انتخاب کرنا پڑتا ہے جو ان کے ڈگری کورس میں شامل تھے چہ جائیکہ وہ ان مضامین کے معلم ہوں یا نہ ہوں جن کی وجہ سے بی۔ایڈ کرنے کے بعد بھی اپنے خاص مضمون یا جس مضمون کے وہ معلم ہیں وہ اپنے مضمون کے طریقۂ تدریس سے نابلد ہی رہ جاتے ہیں۔ لہٰذا مسئلہ بڑی شدت کے ساتھ ابھرآتا ہے کہ معلم اپنے مضمون کی تدریس کو کس طرح کمال کو پہنچائیں اور بچے ان کی تدریس سے کیسے مستفیض ہوں۔

مغربی بنگال اردو اکادمی ایسا ادارہ ہے جو اس کی سبیل نکال سکتا ہے جس طرح ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، نئی دہلی اس کا انتظام کرتی ہے خواہ وہ بطور مختصر مدتی کورس (Short Term Course) یا ریفریشر کورس (Refresher Course) اور ینٹیشن کورس (Orientation Course) کی شکل میں ہی کیوں نہ ہو۔ ایسے کورسوں میں اردو یا فارسی کے معلموں کو ان مضامین کا طریقۂ تدریس سیکھنے کا انتظام کیا جا سکتا ہے مگر اب تک اکادمی نے اس سلسلے میں کوئی پیش رفت نہیں کی ہے۔

مغربی بنگال میں اردو میڈیم گورنمنٹ پرائمری ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ واحد سرکاری کالج ہے جو ضلع ہگلی میں واقع ہے۔ یہاں ایک سیشن کے لیے 96 نشستیں مخصوص ہیں جن میں 48 نشستیں نئے طالب علموں کے لیے اور 48 برسرکار معلموں کے لیے ہیں۔ 2004 تک صورت حال یہ تھی کہ مغربی بنگال کے سبھی اضلاع سے خواہش مند طلبہ درخواست کرتے تھے پھر ان کے درمیان میرٹ کی بنیاد پر داخلہ ہوتا تھا مگر 2005 میں مغربی بنگال میں نیا قانون نافذ ہوا کہ جن اضلاع میں پرائمری ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ ہیں ان کالجوں میں اسی ضلعے کے طالب علموں کا انتخاب ہوگا اور 2005 کے تعلیمی سال سے اسی پر عمل ہو رہا ہے۔ اب دشواری یہ ہے کہ ہگلی کے سوا دیگر ضلعوں کے بچوں کا داخلہ کہاں ہو جب کہ حکومت کا یہ قانون ہے کہ پرائمری اسکولوں میں نوکری کے مجاز وہی طلبہ ہوں گے جنھوں نے پرائمری ٹیچرز ٹریننگ کی ڈگری حاصل کر رکھی ہے۔ حکومت نے ایسی سہولت بھی فراہم کر رکھی ہے کہ کوئی ٹرسٹ اگر چاہے تو کسی بھی ضلعے میں پرائمری ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ بطور نجی ادارہ قائم کر سکتا ہے اس کے تحت بردوان ضلعے میں Scholastic P.T.T.I. اور شمالی دیناج پور میں S.K.S.P.T.T.I. نام کے دو ادارے قائم کیے گئے جہاں 50 فیصد اردو میڈیم طالب علموں کی تربیت کی سہولتیں ہیں۔ پرائیویٹ کالجوں میں داخلے کی فیس حکومت کے کالجوں سے بہت زیادہ ہے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ پرائیویٹ کالجوں میں فیس داخلے کے مجاز طلبہ کی استطاعت سے زیادہ ہوتی ہے جس کے باعث داخلے کا موقع ملنے کے باوجود وہ داخلہ نہیں لے پاتے ہیں۔ اردو ذریعۂ تعلیم کی راہ میں آنے والی ان رکاوٹوں کو جلد از جلد دور کرنے کے لیے حکومت اور اردو اداروں کو عملی اقدام کرنے ہوں گے تاکہ اردو طلبہ کو معیاری تعلیم کے حصول میں کسی دشواری کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

Urdu Medium Govt. Teachers Training Institute
P.O. Nalikul-712407
Distt. : Hooghly (W.B.)

□□□

تحریر: ہردیر سنگھ
ترجمہ: محمد عمر رضا

خواتین اور ترقی کی رفتار

ماہرین اقتصادیات کی ایک بڑی جماعت روزگار کے میدان میں خواتین کی بڑھتی حصے داری کو ہی دنیا کی اقتصادی ترقی کے نئے انجن کی صورت میں دیکھ رہی ہے۔ اس سے روزگار کے مواقع بڑھے ہیں، اور خواتین ایسے کاموں کو تیزی سے اپنا رہی ہیں جن کی بازار میں کافی مانگ ہے۔ مزید برآں بیشتر ممالک کی کل گھریلو پیداوار میں بھی خواتین کا تعاون بڑھ رہا ہے۔

ملک اور بیرون ملک میں اقتصادی مورچے پر ایک خاموش انقلاب آ رہا ہے جو اقتصادی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ بننے والا ہے۔ یہ انقلاب ہے کام کاج کے میدان میں خواتین کی بڑھتی حصے داری۔ امریکہ جیسے ترقی یافتہ ملک اور دنیا کے سب سے بڑے اقتصادی نظام سے لے کر بنگلہ دیش جیسے ترقی پذیر ملک میں یہ تبدیلی دیکھی جا سکتی ہے۔ بیشتر ممالک کی کل گھریلو پیداوار میں عورتوں کا تعاون بڑھ رہا ہے۔ اس لیے ماہرین اقتصادیات کی ایک بڑی جماعت روزگار کے میدان میں عورتوں کی بڑھتی حصے داری کو ہی دنیا کی اقتصادی ترقی کے نئے ذریعے کی شکل میں دیکھ رہی ہے۔ خواتین کی بڑھتی حصے داری کا اہم سبب اقتصادی نظام میں نئے انداز کے ایسے روزگاروں کا اضافہ ہے جو عورتوں کے لیے زیادہ موزوں ہیں اور ساتھ ہی ساتھ ان میدانوں کی شرح ترقی بھی اقتصادی نظام کے دوسرے میدانوں کے مقابلے میں زیادہ تیز رفتار ہے۔

بین الاقوامی سطح پر جو حقائق سامنے آ رہے ہیں، ان کے مطابق امریکہ میں کام کرنے والی خواتین کی تعداد ایک تہائی سے بڑھ کر دو تہائی ہو گئی ہے۔ حالاں کہ اٹلی اور جاپان میں یہ ابھی بھی 40 فی صد ہے، لیکن یورپی ممالک میں یہ اعداد و شمار 50 سے 60 فی صد کے درمیان ہیں۔ مشرقی ایشیائی ممالک میں تو برآمد کے میدان میں عورتوں کا تعاون 100 مردوں پر 83 خواتین تک پہنچ گیا ہے۔ موقر اقتصادی رسالے Economist کے مطابق عورتوں کی محنت کا ابھی پورے طور پر اندازہ نہیں لگایا جا سکا ہے جو عالمی اقتصادی نظام کی شرح ترقی کی طویل المدت تیزی کی سب سے بڑی کنجی ہے۔ ترقی یافتہ ممالک کے اقتصادی نظام میں عورتوں کے کام کاج کا حصہ کل گھریلو پیداوار کے 40 فی صد تک پہنچ گیا ہے اور ان کی گھریلو ذمہ داریوں کو بھی شامل کر لیا جائے تو یہ سطح 50 فی صد کو پار کر جاتی ہے۔ عالمی اقتصادی فورم کے ایک مطالعے میں بھی خواتین کی بہتر صورت حال اور کل گھریلو پیداوار کے درمیان براہ راست تعلق ہونے کی بات کہی گئی ہے۔

یہ تبدیلی اقتصادی آزادی کی پالیسیوں کے نفاذ کے ڈیڑھ دہائی کے بعد ہندوستان میں بھی نظر آنے لگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے سب سے بڑے بینک آئی سی آئی سی آئی کی ذمے داری سنبھالنے والوں میں جوائنٹ ایڈمنسٹریٹو ڈائرکٹر للتا گپتے ہیں تو کلپنا مور پریا ڈپٹی ایڈمنسٹریٹو ڈائرکٹر ہیں اور چندا کوچر ایگزیکٹیو ڈائرکٹر ہیں۔ جب کہ آئی. سی. آئی. سی. آئی. وینچر کی ایڈمنسٹریٹو ڈائرکٹر سی. آئی. او. رینو کا رام ناتھ ہیں۔ بین الاقوامی بینک ایچ. ایس. بی. سی. کی ہندوستانی چیف نینا لال قدوائی ہیں۔ علاوہ ازیں انڈین ریزرو بینک کے ایگزیکٹیو ڈائرکٹروں میں بھی — دو خواتین اوشا تھوراٹ اور شیامالا گوپالن شامل ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی ٹھنڈی مشروبات کی کمپنی پیپسی کوک چیف اندرا نوئی بھی ہندوستانی خاتون ہیں۔

تھرمیکس گروپ کو نقصان سے فائدے میں لانے کا کارنامہ انو آغا نے کر دکھایا اور ان کی بیٹی مہر آغا کمپنی کو سنبھال رہی ہیں۔ سلجا فردویا موٹوانی کائی نیٹک موٹرس چلاتی ہیں، جو اب فور موٹرس میں تبدیل ہو گئی ہے جب کہ ملک کی دوسری سب سے بڑی ٹریکٹر بنانے والی کمپنی ٹیفے کی ذمے داری ملکا سری نواسن نے سنبھالی ہے۔ جنوبی ہند میں ہی راج شری شوگر کو راج شری پتی چلاتی ہیں اور کوئمبٹور کی ایک بڑی ٹیکسٹائل کمپنی چندر ٹیکسٹائل کی ذمہ داری سنبھال رہی ہیں نندنی رنگا سوامی۔ ملک میں پولٹری صنعت کے سب سے بڑے گروپ وینکٹیشور ہیچریز کو انورادھا دیسائی سنبھال رہی ہیں۔ مذکورہ خاندانی کاروبار سنبھالنے والی خواتین کے علاوہ کرن مجمدار شا جیسی خاتون صنعت کار بھی ہیں جنھوں نے خود بایوکان جیسی کمپنی قائم کی۔ اقتصادی نظام کے تیسرے سیکٹر کوآپریٹو (Co-operative) میں امرتا پٹیل نے اپنی انفرادیت قائم کی ہے۔ آندھرا پردیش کے کریم نگر میں پورے طور پر خواتین کے ذریعے چلائی جانے والی مُلکنور ڈیری کے قیام میں ان کا اہم کردار رہا ہے۔ اسی طرح مہاراشٹر میں کئی خاتون کوآپریٹو بینک ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ خواتین پہلے کام نہیں کرتی تھیں، وہ ہمیشہ سے مردوں کی طرح کام کرتی رہی ہیں لیکن ان کی ذمہ داریوں کا شمار ادائیگی کے بدلے خریدی جانے والی محنت میں نہیں ہوتا ہے اور ان کے اس تعاون کو کل گھریلو پیداوار میں شامل نہیں کیا جاتا ہے۔ لیکن اب مرد اور خواتین کے درمیان کام کرنے کا تناسب بدل رہا ہے۔ عورتوں کی حصے داری میں رفتہ رفتہ اضافہ ہو رہا

ہے۔اس کی ایک بڑی وجہ جہاں ہندوستان جیسے ملک میں عورتوں کی شرح خواندگی میں اضافہ ہونا ہے وہیں ایک بڑے متوسط طبقے کا ابھرنا اور اس کی اقتصادی طور پر خود کو مضبوط کرنے کی شدید خواہش اور مجبوری بھی اس کا سبب ہے۔خواندگی کے اعداد وشمار یہ ثابت بھی کرتے ہیں۔1951 میں جہاں پانچویں درجے تک محض 28.1 فیصد لڑکیاں اسکول جاتی تھیں،اب یہ تعداد 43 فیصد تک پہنچ گئی ہے۔اس وقت صرف 10 فی صد لڑکیاں ہی گریجویشن پاس یا اعلیٰ تعلیم میں داخلہ لیتی تھیں،لیکن اب یہ تعداد بڑھ کر 33.5 فیصد ہوگئی ہے۔یہ اعداد وشمار اس بات کا واضح اشارہ ہیں کہ خواتین کے معیار تعلیم میں بہتری آئی ہے اور ان کے لیے نوکری حاصل کرنے کے مواقع میں اضافہ ہوا ہے۔

ہندوستانی اقتصادی نظام میں شعبۂ خدمت(service sector) کی حصے داری 56 فیصد تک پہنچنے سے صورت حال تبدیل ہوئی ہے۔اطلاعاتی صنعت، خردہ فروشی، تجارتی اور فنانس سروس، سیاحت، تفریح، تعلیم، صحت، ہوٹل، ذرائع ابلاغ، کیٹرنگ، قانونی خدمات، کال سینٹر، مشاورت اور صارفی خدمات جیسے نئے شعبے ابھر کر سامنے آئے ہیں۔ان میدانوں میں خواتین کے لیے کام کے مواقع میں کس طرح اضافہ ہوا ہے اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کال سینٹر جیسے نئے شعبے میں خواتین کی تعداد 40 فی صد ہے۔

تجارتی تنظیم فکی (Ficci) کے ایک سروے کے مطابق اقتصادی ترقی میں خواتین کی حصے داری مسلسل بڑھ رہی ہے۔اس کا سبب شعبۂ خدمت میں ایسے روزگار کے مواقع کا مہیا ہونا ہے جہاں عورتیں زیادہ اہلیت سے اور مسابقتی کارکن کی شکل میں کام کرسکتی ہیں۔ملک کے پانچ بڑے شہروں میں کرائے گئے اس سروے میں خواتین کام کاج کو لے کر مطمئن نظر آتی ہیں اور، ان کے فیصلے لینے کی حصہ داری میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ایک دوسرے سروے کے مطابق صارفی مصنوعات کی خرید کے لیے فیصلوں میں خواتین کی رائے کی اہمیت بڑھ رہی ہے اور کچھ ممالک میں 80 فی صد معاملوں میں خواتین کا فیصلہ ہی آخری فیصلہ ہوتا ہے۔لیکن فکی کے سروے میں جو بات ابھر کر سامنے آئی ہے، اس کے مطابق 35.6 فیصد خواتین کلرک یا سیلز گرل کے طور پر کام کرتی ہیں جب کہ سپروائزر کی سطح پر ان کی تعداد 14.1 فی صد ہے اور اعلیٰ عہدیدار کی سطح پر یہ تعداد صرف 4.3 فی صد رہ جاتی ہے۔ایک دوسری تجارتی تنظیم سی آئی آئی کا سروے بھی یہ ثابت کرتا ہے،جس کے مطابق ہندوستان میں تجارت کے شعبے میں اونچے مقام پر خواتین کی تعداد صرف چار فیصد ہے اور شمالی ہند میں ایک فیصد ہی ہے۔یہی صورت حال تقریباً پوری دنیا میں ہے اور بورڈ آف ڈائرکٹوریٹ میں خواتین کا اوسط سات فیصد ہے۔حالاں کہ امریکہ میں بورڈ آف ڈائرکٹوریٹس میں خواتین کی تعداد 15 فیصد ہے لیکن جاپان میں محض ایک فی صد ہے۔

ہندوستانی اقتصادی نظام کے کئی ایسے شعبے بھی ہیں جہاں روایتی انداز سے خواتین کی حصے داری ہی زیادہ رہی ہے۔جنوبی ہند میں ماچس کی صنعت میں بالغ محنت کشوں میں عورتوں کی تعداد 60 فی صد ہے۔ملک کے سب سے بڑے گارمنٹ ایکسپورٹ پیداوار میں 60 فی صد سے زیادہ خواتین کام کر رہی ہیں۔چائے کے باغ تو خواتین کی محنت کی بدولت ہی چلتے ہیں۔ملک کے مغربی حصے میں سمندری کھانا تیار کرنے والی صنعتوں میں عورتیں ہی زیادہ کام کر رہی ہیں۔مویشیوں کو پالنے کی زیادہ تر ذمہ داری بھی عورتوں کے ہی پاس ہے۔اس لیے نئے شعبے ہی نہیں، روایتی شعبوں میں بھی عورتوں کی محنت کی حصے داری اور پیداوار میں ان کا تعاون کم نہیں ہے۔

لیکن سرکاری اعداد وشمار پر غور کریں تو تصویر صاف نظر نہیں آتی۔سال 2001 کی مردم شماری کے مطابق ملک میں برسر روزگار افراد کی آبادی 40.21 کروڑ تھی۔ان میں سے 27.54 کروڑ مرد اور 12.70 کروڑ عورتیں تھیں۔گاؤں کے علاقے کی 31.06 کروڑ کی کل کام کرنے والی آبادی میں مردوں کی تعداد 19.92 کروڑ تھی جبکہ عورتوں کی تعداد 11.14 کروڑ تھی۔شہری کام کرنے والی آبادی کے 9.18 کروڑ کی تعداد میں مردوں کی تعداد 7.62 کروڑ اور خواتین کی تعداد 1.1 کروڑ تھی۔ہر پانچ آدمی پر ایک خاتون شہری علاقے میں کام کرنے والی تھی۔

سرکاری اعداد وشمار کے مطابق 31 مارچ 2002 کو منظم شعبوں کے تحت پرائیویٹ اور پبلک سیکٹروں میں 49.5 لاکھ خواتین برسر روزگار تھیں جو منظم شعبے کے کل روزگار کا 18.1 فی صد ہے۔کمیونٹی، سماجی اور ذاتی نوکریوں میں خواتین کی تعداد 56.5 فی صد، تعمیر کے کام میں 20.6 فی صد، زراعت اور اس سے متعلق کاموں میں 9.4 فی صد، فنانس، بیما اور فنانشیل سروسوں میں ان کی تعداد 5.2 فی صد تھی۔جن صوبوں میں خواتین کی خواندگی زیادہ ہے وہاں روزگار میں ان کی حصے داری بھی زیادہ ہے۔یہی وجہ ہے کہ جنوبی اور مغربی ہندوستان میں اقتصادی کارکردگیوں میں خواتین کی حصے داری شمالی ہندستان کے صوبوں سے کہیں زیادہ ہے۔ملک کے ان حصوں کے درمیان ترقی میں فرق کی ایک بڑی وجہ یہ بھی رہی ہے۔

مذکورہ اعداد وشمار روزگار میں خواتین کی حصے داری کی بہت حوصلہ افزا تصویر تو پیش نہیں کرتے لیکن اس بات کی جانب اشارہ ضرور کرتے ہیں کہ اقتصادی نظام کے نئے شعبوں میں مرد محنت کشوں کے مقابلے ان کے تناسب میں یقینی طور پر اضافہ ہوگا۔خواتین کی سلیقہ مندی اور کام کے تئیں زیادہ سپردگی بھی ان کے حق میں ہے۔ساتھ ہی محنت کشوں کے تنازعات کے امکانات خواتین کی بڑھتی تعداد کے ساتھ کم ہوجاتے ہیں کیوں کہ یہ محض ایک اتفاق ہی نہیں ہے کہ آج ملک کی ٹریڈ یونینوں میں ایک بھی خاتون نہیں ہے۔ایک اور بات جو صنعتی دنیا کے لیے سودمند ثابت ہوتی ہے،وہ ہے خواتین کا مردوں کے مقابلے کم تنخواہ پر کام کے لیے تیار ہوجانا۔صنعتی دنیا میں عورتوں کی تنخواہ کا اوسط

مردوں کے مقابلے دو تہائی ہے۔ یہ بات دیگر ملکوں میں بھی رائج ہے۔ اس کے ذریعے صنعتی دنیا کم لاگت پر زیادہ پیداوار حاصل کر کے منافع میں اضافے کا راستہ بھی تلاش رہی ہے۔ حالاں کہ ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ عورتیں خود اس تعلیم اور صحت جیسے میدان میں جاتی ہیں جہاں تنخواہ زیادہ نہیں ہے اور آگے بڑھنے کے امکانات بھی کم ہیں، لیکن اسے پورے طور پر سچ نہیں مانا جاسکتا۔

یہ حقیقت ہے کہ ابھی تک اقتصادی ترقی میں خواتین کی حصے داری کا مکمل فائدہ نہیں اٹھایا جا سکا ہے، لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ یہ ایک ایسا متبادل ہے جس کے استعمال سے اقتصادی نظام کی ترقی کے پہیے کو تیز کیا جا سکتا ہے۔ اقتصادی نظاموں کے بدلتے ڈھانچے اور کام کاج کے میدان میں بدلتی صورت حال اس امید کو مزید تقویت بخشتے ہیں۔

خواتین کے لیے نوکریاں

14 سے 64 سال کی عمر کے درمیان برسر روزگار خواتین 2004 کے اعداد و شمار کے مطابق ڈنمارک میں 72 فیصد، سویڈن میں 72 فیصد، کناڈا میں 68 فیصد، برطانیہ میں 66 فیصد، امریکہ میں 65 فیصد، جرمنی میں 60 فیصد، جاپان میں 58 فیصد، فرانس میں 57 فیصد، اسپین میں 49.5 فیصد، اور اٹلی میں 55 فیصد ہیں۔

زراعت کے میدان میں تانیثیت کے اثرات

پروفیسر بینا اگروال رقم طراز ہیں کہ خواتین کام تو ہمیشہ کرتی رہی ہیں لیکن اعداد و شمار میں ان کی نمائندگی نہیں ہو پائی۔ وہ پیداوار کا ذریعہ تو ہمیشہ سے رہی ہیں لیکن ان کی محنت کا اعتراف بازار میں نہیں ہو سکا تھا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جو کام براہ راست بازار کی کارکردگی سے منسلک ہیں ان پر مردوں کا ہی غلبہ رہا لیکن ادھر شرح تعلیم میں اضافے کے سبب گاؤں اور بالخصوص شہری علاقوں میں خواتین نے ایسے کاموں کو اپنے ہاتھوں میں لیا ہے جن کا براہ راست تعلق بازار، پیداواریت اور انتظامیہ سے ہے۔ خواتین اب کئی ایسے عہدے سنبھال رہی ہیں جن سے ان کی قابلیت اجاگر ہوتی ہے اور بازار کے حساب سے اس کا تخمینہ لگایا جانے لگا ہے۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں کل گھریلو پیداوار میں ان کے تعاون کا شمار تو ہوگا ہی۔ خواتین کا یہ دخل تمام شعبوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے ایک دوسرے پہلو کی نشاندہی بھی ضروری ہے۔ گاؤں میں زراعت کے میدان میں کام کرنے والے زیادہ تر مرد شہروں میں ہجرت کرنے لگے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ زراعت اب دیہی خواتین کا ایک بڑا سہارا بن گئی ہے۔ 73-1972 میں ہندوستان میں زرعی شعبے میں کام کرنے والے کل دیہی محنت کش 84 فی صد تھے۔ 2000-1999 میں یہ کم ہو کر 76 فیصد ہو گیا۔ یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ 8 فی صد کی یہ گراوٹ اس لیے آئی کہ زراعت سے غیر زرعی شعبے میں جانے والوں میں بڑی تعداد مردوں کی رہی۔ مستقبل میں بھی یہی صورت حال جاری رہنے کی امید ہے۔ اس طرح آنے والے دنوں میں خواتین زراعت اور اس سے متعلقہ کاموں میں زیادہ سے زیادہ نظر آئیں گی۔ جوں جوں مرد غیر زرعی معاش کی طرف بڑھیں گے، خواتین کو وہ کام اپنے ہاتھ میں لینا ہوں گے جو اب تک مرد کرتے آئے ہیں۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ زراعت کے میدان میں تانیثیت کے ابتدائی اثرات ہیں۔ جنوب مشرقی ایشیا کے کئی ممالک میں 1970 کی دہائی کے ابتدائی برسوں میں یہی صورت حال نظر آئی۔ مثال کے طور پر ملیشیا میں جب زیادہ سے زیادہ مرد غیر زرعی شعبے کی طرف بڑھے تو خواتین نے وہ تمام کام کرنے شروع کر دیے جو روایتی طور پر مرد ہی کیا کرتے تھے۔

خواتین کی خدمات کا اعتراف کرنے کی ضرورت

خواتین کی خدمات کا اعتراف و احترام کرنے کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے سیدہ حمید، رکن منصوبہ بندی کمیشن کی رائے کے مطابق عالمی اقتصادی نظام میں عورتوں کی حصے داری میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لیکن تمام ترقی پذیر ممالک میں وہ ہنوز استحصالی حالات میں کم تنخواہ پر کام کر رہی ہیں۔ وہ اب بھی سستی محنت کش ہیں۔ دراصل بین الاقوامی کمپنیاں ان ملکوں کو ہی سب سے پہلے اپنا نشانہ بناتی ہیں جہاں محنت سستی ہو۔ ان کی آمد کسی زلزلے سے کم نہیں۔ بین الاقوامی کمپنیوں کو ہندوستان اسی لیے پسند ہے کیوں کہ ایک تو یہاں محنت ارزاں ہے مزید خواتین کو اجرت کم دی جاتی ہے۔ یہی نہیں ہندوستان کے ساتھ ساتھ دیگر ترقی پذیر ممالک میں بھی عورتوں کو ان کی محنت کی وہ قیمت نہیں دی جاتی جو مردوں کو دی جاتی ہے۔ عزت افزائی کی تو بات ہی الگ ہے۔ لہٰذا ہم نہیں چاہتے کہ ترقی کے نام پر عورتیں کم تنخواہ پر اور ناموزوں حالات میں کام کریں۔ ہمیں ایسی ترقی نہیں چاہیے۔ اب جب کہ ہندوستان اقتصادی طاقت بننے جا رہا ہے تو ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے یہاں خواتین کو طاقت ور بنانے کا عمل پورے وقار کے ساتھ انجام پذیر ہو۔ انھیں ان کی محنت کی واجب قیمت ملے۔ کام کاج کے حالات میں بہتری پیدا ہو۔ اسی لیے کوئی بھی منصوبہ تیار کرتے وقت ہم یہ یقینی بنانے کی کوشش کرتے ہیں کہ اپنے یہ مقاصد حاصل کر سکیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ اپنے ہنر کو اقتصادی بازار سے وابستہ کر سکیں۔ مثال کے طور پر شمال مشرقی ہند کے ہر گھر میں چرخہ ہے۔ وہاں کی عورتیں خاص طرح کی بنائی اور ہاتھ کے کام میں ماہر ہیں۔ لیکن انھیں ان کے کام کی پوری قیمت نہیں مل پاتی۔ ہماری کوشش ہوگی کہ گیارھویں پنج سالہ منصوبے میں ان کے اس ہنر کو بازار سے براہ راست جوڑا جائے۔ ان دنوں ہمارے یہاں بھی محنت میں بہتری پیدا کرنے کی بات کی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے بہتری کی یہ باتیں تبھی کارآمد ثابت ہو پائیں گی جب ہمارے یہاں خواتین کو صحیح معنوں میں اقتصادی مساوات مل پائے گی۔

(بشکریہ "ہندوستان" دہلی، 23 اپریل 2006)

□□□

تحریر: سنجے اُدے ورما
ترجمہ: محمد عمر رضا

جاپانی سوپر سونک طیارہ: آواز سے دوگنی رفتار

اڑان کے سو سال کی تاریخ میں انسان نے طیارہ کے میدان میں تمام بلندیوں تک رسائی حاصل کی ہے۔ اپنے طیاروں سے وہ رفتار پائی ہے، جس کا شاید تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن انسان کی تیز رفتار پانے کی خواہش تمام مشکلات و حادثات کے باوجود بڑھتی ہی جا رہی ہے اسی خواہش کا ایک نمونہ اب جاپان پیش کرنے والا ہے، جب اس کی خلائی ایجنسی تیر کی شکل وصورت اور آواز سے دوگنی رفتار والے سوپر سونک طیارے کا تجربہ کرے گی۔ تین سال قبل جاپان نے خود اسی طرح کے بغیر انسان والے سوپر سونک طیارے کا ٹیسٹ کیا تھا، لیکن وہ طیارہ بوسٹر سے الگ ہونے کے بعد ریگستان میں گر کر تباہ ہوگیا تھا۔ اس حادثے نے جاپان کو پروگرام رد کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔

اس دوران دنیا کے مشہور ومعروف سوپر سونک طیارے کانکورڈ کا سفر بھی ختم ہو چکا ہے۔ لیکن جاپان کی ضد ہے کہ وہ انسانی معاشرے کو ایسے تیز رفتار طیارے دے کر ہی چین کی سانس لے گا۔ جاپان ایرو اسپیس ایکسپلوریشن ایجنسی (جاکسا) کا منصوبہ ہے کہ وہ میک-2 (یعنی آواز سے دوگنی) رفتار والا اور کم سے کم 300 مسافر والا ایسا طیارہ بنائے، جس سے ٹوکیو سے لاس اینجلس تک کا سفر چار گھنٹے میں طے کیا جا سکے۔

آسٹریلیا کی وومیرو ٹیسٹ رینج میں فرانس کے ساتھ مل کر جاکسا اس طرح کے ایک آزمائشی طیارے کا تجربہ کرے گی۔ اس طیارے کو ایک راکٹ کی مدد سے آسمان میں 20 کلومیٹر (12.4 میل) کی بلندی تک لے جایا جائے گا جو طیارے کو میک-2 کی رفتار دے کر اس سے الگ ہو جائے گا۔ دوران تجربہ طیارہ 15 منٹ تک ہوا میں رہے گا اور پھر پیراشوٹ کی مدد سے زمین پر اتارا جائے گا۔ یوں تو ایرواسپیس کے میدان میں جاپان کا کچھ خاص دخل نہیں ہے، لیکن توقع کی جا رہی ہے کہ اس کے سوپر سونک طیارے بنانے میں کامیابی حاصل کر لینے پر طیارے کے میدان میں جاپان کی ساکھ مزید مستحکم کی جائے گی۔ دعویٰ کیا جا رہا ہے کہ جاپان اب تک کانکورڈ قسم کے طیاروں کے ساتھ پیش آنے والی دو مشکلات پر قابو پا چکا ہے۔ کانکورڈ کو اس کے جیٹ انجن کے زبردست شور اور بہت زیادہ ایندھن کھپت کے معاملے میں غیر مفید پایا گیا تھا، لیکن جاپان نے نظریاتی طور پر ایسا انجن بنانے میں کامیابی حاصل کر لی ہے، جو کم شور کرتا ہے اور میک 5.5 یعنی آواز سے پانچ گنی سے زیادہ کی رفتار پا سکتا ہے۔ اگر اپنے آزمائشی مرحلے میں اس سوپر سونک طیارے کو کامیابی حاصل ہوتی ہے تو جاپان کا منصوبہ 2020 تک اس طرح کے طیاروں کی تجارتی پروازیں شروع کرنے کا ہے۔

پچھلے سال امریکی خلائی ایجنسی ناسا نے اسکریم جیٹ انجن کی مدد سے چلنے والے ہوائی جہاز ایکس-43اے کا تجربہ کیا، تو اس نے آواز سے سات گنی زیادہ رفتار کی حد کو پار کرتے ہوئے 8000 کلومیٹر فی گھنٹہ رفتار پکڑی۔ اس رفتار کی کیا اہمیت ہے، اسے ایک مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ فرض کیجیے کہ کوئی طیارہ میک-5 یعنی قریب پانچ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پرواز کرتا ہے۔ تب دلی سے 14 ہزار کلومیٹر دور موجود ہو، تو ایسے طیاروں سے 4,149 کلومیٹر کی مسافت کو چند منٹوں میں طے کرنے کا یہ عمل فی الحال وفاقی مقاصد کے پیش نظر کیا جا رہا ہے اور ایسے طیاروں کی تجارتی پروازوں کا کوئی منصوبہ نہیں ہے، پھر بھی جاپان جو خواب دیکھ رہا ہے، اس سے ایک بار پھر کانکورڈ کی واپسی طے لگ رہی ہے۔

کیا ہے سوپر سونک رفتار؟

ہوا میں آواز کی رفتار تقریباً 340 کلومیٹر فی سیکنڈ ہوتی ہے۔ موٹے طور پر یہ ریسنگ کار کی مقررہ رفتار سے چار گنی زیادہ ہوتی ہے۔ جب کوئی طیارہ آواز کی رفتار سے بھی تیز دوڑنے لگتا ہے تو اسے ساؤنڈ بیریر یعنی آواز کی حد توڑنے والا کہا جاتا ہے۔ ایسی رفتار پانے پر طیارے کا انجن بہت تیز آواز کرتا ہے۔ ایسی دھماکے دار آواز انسان کے سننے کی قوت برداشت سے زیادہ ہوتی ہے۔ اس طرح کی آواز "سونک بوم" کہلاتی ہے۔ ایسے طیاروں کو خاص قسم کے جیٹ انجن سے چلایا جاتا ہے۔ آج کل کے سبھی مسافر بردار طیارے جیسے کہ جمبو جیٹ (بوئنگ 747)، اے 300، ایئربس-320، بوئنگ 737، بوئنگ-767 وغیرہ جیٹ انجن کے ذریعے ہی چلائے جاتے ہیں۔ اس طرح کے طیاروں کی رفتار کے پیچھے نیوٹن کا وہ نظریہ کارفرما ہوتا ہے، جس میں ہر عمل کے مساوی اور مخالف ردعمل ہوتا ہے۔ جیٹ انجن میں ایندھن اور ہوا کا گھول بھاری دباؤ کے ساتھ جلتا ہے۔ یہی گھول تیزی کے ساتھ پیچھے کی طرف نکلتا ہے۔ اسی سے انجن کو آگے بڑھنے کی رفتار ملتی ہے۔ آج کل کے بڑے اور طاقتور جیٹ طیارے اسی بنیاد پر تیز رفتاری سے پرواز کرتے ہیں۔

(بشکریہ "ہندوستان" نئی دہلی، یکم ستمبر 2005)

□□□

224-E, Mahanadi, JNU
New Delhi-110067

جمال نصرت

پانی اور ہمارا جسم

ہمارے جسم میں 71 فی صد پانی ہے۔ جسم کا پانی پیشاب، پسینے اور فضلہ کی شکل میں جسم سے نکلتا ہے۔ جب ہم سانس لیتے ہیں تو اس میں بھی بھاپ کی شکل میں ہمارے جسم کا پانی نکلتا رہتا ہے۔ جب ہم آرام کرتے یا سوتے ہیں تب بھی تقریباً 150 ملی لیٹر پانی فی گھنٹے کے حساب سے ہمارے جسم سے باہر نکلتا رہتا ہے جسے ہم پانی پی کر پورا کرتے ہیں۔ کم پانی کی وجہ سے نقاہت پیدا ہوگی اور اگر یہ کمی زیادہ ہو جائے تو موت بھی واقع ہو سکتی ہے۔ ماہرین طب کے مطابق ایک آدمی کو کم سے کم 8 لیٹر پانی روز پینا چاہیے۔ اگر ہمارے جسم کا محض 15 فی صد پانی ہی کم ہو جائے تب بھی موت ہو سکتی ہے۔ اسی لیے ہیضہ یا پیچش جیسی بیماریوں میں زیادہ پانی اور منرل کے استعمال کی صلاح دی جاتی ہے۔ اس میں گلوکوز بھی دیا جاتا ہے۔

جسم میں چار فی صد پانی پلازما کی شکل میں خون میں ہے۔ جسم کے خلیوں کے باہر 40 فی صد پانی ہے اور خلیوں کے اندر 16 فی صد پانی ہے۔ اس کے علاوہ 40 فی صد پانی جسم کے دوسرے حصوں میں ہے۔ پیٹ، پھیپھڑوں اور جگر کے علاوہ ہڈیوں، بالوں، اور جسم کے سب سے سخت حصے دانت میں بھی پانی موجود ہے۔ دانت میں پانی کی مقدار بہت کم ہے۔

اونٹ ایک ایسا جانور ہے جو اپنے پیٹ کی تھیلی میں اتنا پانی جمع کر لیتا ہے، کہ اگر اسے آٹھ دس دنوں تک پانی نہ بھی ملے تب بھی وہ اس تھیلی سے پانی پی کر زندہ رہتا ہے اور اگر پانی مل جاتا ہے تو وہ پی بھی لیتا ہے اور پھر سے اپنی تھیلی میں پانی جمع کر لیتا ہے۔ پانی صفر ڈگری سینٹی گریڈ پر جم جاتا ہے۔ 100 حصے پانی جم کر 109 حصے برف بناتے ہیں۔ اسی لیے اگر برف کو پانی میں ڈالیں تو ایک حصہ باہر رہتا ہے اور 9 حصے پانی کے اندر رہتے ہیں۔

پانی کا پیمانہ

پانی جہاں میٹھا ہوتا ہے وہیں کھارا اور تیزابی بھی ہوتا ہے۔ اس کے لیے ایک پیمانہ بنایا گیا ہے جو کہ پی ایچ پیمانہ کہلاتا ہے۔ یہ ایک سے 14 تک ہوتا ہے۔ اگر یہ گنتی 7 ہوئی تو پانی نہ کھارا ہوگا اور نہ ہی تیزابی بلکہ صرف پانی ہے اور اگر یہ اعداد 7 سے زیادہ ہیں تو پھر یہ پانی کھارا ہوگا اور اگر کم ہیں تو یہ پانی تیزابی ہوگا۔ اور اگر پانی کی یہی صورت حال ہمارے جسم میں ہو جاتی ہے تو ہم تیزابیت یا ایسیڈٹی کے شکار ہو جاتے ہیں اگر یہ 7 سے زیادہ ہو جاتی ہے تو جسم میں کھارا پن پیدا ہو جاتا ہے جس سے الٹی بھی آ سکتی ہے۔ عام زبان میں کہا بھی جاتا ہے کہ یہاں کا پانی ہمارے موافق نہیں ہے یا ہمارے موافق ہے۔

ایسی صورت میں ہمیں کھارے پن میں تیزابی اور تیزابیت میں کھاری چیزوں کا استعمال کرنا چاہیے۔

پی ایچ کی گنتی	چیزیں
1.	جیسے کلورین کا تیزاب
2.	لیموں کا رس
3.	سرکہ یا کولا
4.	ٹماٹر یا کالی کافی
5.	عام پانی یا ابتدائی بارش کا پانی
6.	ہمارا تھوک یا پیشاب
7.	صاف پانی، آنسو یا خون
8.	سمندر کا پانی
9.	خمیرہ یا کھانے والا سوڈا
10.	نمکین جھیلوں کا پانی
11.	امونیا
12.	بلیچنگ پاؤڈر یا بجی مٹی، ادسر والی مٹی
13.	صفائی کے صابن یا ریٹھا
14.	کپڑے دھونے والا تیز صابن

آج جب دنیا کی آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ہو رہا ہے اور آبی آلودگی پر قابو پانے کے لیے خاطر خواہ سنجیدہ کوششیں نہیں ہو رہی ہیں۔ انسان کو خوف ہے کہ اس کے جسم کا 71 فیصد حصہ پانی کہیں کم نہ ہو جائے اور اس کا چراغ زندگی کہیں گل نہ ہو جائے۔

اس صورت حال میں لازمی ہے کہ پانی کی بربادی کو روکا جائے۔ صاف پانی سے صاف کام اور کم صاف پانی سے دوسرے کام لیے جائیں۔ زمین سے ضرورت بھر پانی ہی نکالا جائے۔ جسم میں پانی کی قلت نہ ہونے دیں اور ہمیشہ پینے کے لیے صاف و شفاف پانی ہی استعمال کریں۔

❑❑❑

Roshni-509/148
Old Hyderabad
Lucknow (U.P)

اقبال محی الدین

آب وہوا کے نمونے میں تبدیلی اور اثرات

ہمارے وجود کے لیے ہوا بہت اہمیت رکھتی ہے گو کہ ہم اس کے متعلق ذرا کم ہی غور کرتے ہیں لیکن ماہرین جغرافیہ جب ہمارے اس سیارے کے متعلق تحقیق کرتے ہیں تو وہ ہوا کے اس غلاف کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو کہ کرۂ ارض کو ڈھکے ہوئے ہیں۔ ہوا کا یہی غلاف جو زمین کو پوری طرح لپیٹے ہوئے ہے کرۂ باد یا Atmosphere کہلاتا ہے۔ یہ دراصل کئی قسم کی گیسوں کا ایک آمیزہ ہے۔ یہ گیس ٹھوس زمین پر کشش ثقل (Gravitation) کی وجہ سے قائم رہتی ہے۔ یہ کرۂ باد دراصل ہماری زمین کا ہی ایک حصہ ہے۔

ہمارے اطراف جو ہوا پائی جاتی ہے وہ بھی ایک مادہ ہی ہے کیونکہ اس میں وزن ہوتا ہے۔ یہ دباؤ رکھتی ہے اور مزاحمت پیش کرتی ہے۔ اگر ہوا کی کثافت اور دوران میں فرق واقع ہو جائے یا اس میں کمی آجائے تو انسان پر اس کا بہت اثر پڑتا ہے۔ اس لیے زمین پر گرمی اور سردی کی شدت کو کرۂ باد دھیما کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ یا یوں کہیے کہ یہ بطور ایک کمبل کے کام کرتا ہے اور اس طرح درجۂ حرارت میں ایک اعتدال قائم رکھنے میں مدد کرتا ہے تاکہ زمین کے ایک بڑے حصے پر اتنی زیادہ گرمی اور سردی نہ رہے کہ زندہ رہنا ہی ناممکن ہو جائے۔ یہ کرہ مہلک کائناتی شعاعوں (Cosmic rays) سے ہمیں محفوظ رکھتا ہے۔ یہ مہلک کائناتی شعاعیں برق بارشدہ ذرات ہوتے ہیں جو ہر جہت میں انتہائی تیز روی سے پھیل جاتے ہیں۔ یہ ان شہابی ستاروں (Meteors) سے بھی ہماری حفاظت کرتا ہے جو بیرونی خلا سے زمین پر پھوار کی طرح ٹوٹ پڑتے ہیں۔ تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اگر زمین کے اطراف کرۂ باد کا یہ غلاف نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ جیسا کہ چاند کے اطراف کرۂ باد بالکل نہیں ہے۔ چنانچہ وہاں پر دن کے وقت درجۂ حرارت اپنی انتہا یعنی 100 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتا ہے اور رات میں سخت سردی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے اور درجۂ حرارت منفی 100 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہونچ جاتا ہے۔

عام طور پر اس سلسلے میں کچھ سوالات ابھرتے ہیں جیسے کرۂ باد سے ہمیں کس طرح تحفظ بہم پہنچتا ہے؟ ہمارے اطراف کی ہوا کیسے گرم ہوتی ہے؟ بارش کیسے تشکیل پاتی ہے؟ دنیا میں بارش کی تقسیم غیر مساوی کیوں ہے؟ پہاڑوں پر موسم کیوں ٹھنڈا ہوتا ہے؟ مختلف اصطلاحات جیسے موسم اور آب و ہوا، تقطیر اور بارش میں کیا فرق ہے؟ اگر کرۂ باد کی ترکیب اور ساخت میں کسی وجہ سے تبدیلی ہو جائے تو انسانی زندگی کیسے متاثر ہوگی؟ ان سارے سوالات کا جواب دینے سے پہلے ہمیں آب و ہوا کے قدرتی Pattern یا نمونے کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ اس کے بعد ہی ان سارے سوالات کا جواب ہمیں مل سکے گا۔ پہلے ہمیں کرۂ باد کی ترکیب اور ساخت کا مطالعہ کرنا ہوگا۔ آب و ہوا کی ترکیب (Composition) اور ساخت (Structure) میں کسی طرح کی تبدیلی ہو جائے یا کردی جائے تو انسانی زندگی کہاں تک متاثر ہوگی، اس کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔

آب وہوا کی ترکیب

ہوا کا وہ وسیع غلاف جو کرۂ ارض کو ہر طرف سے محیط کیے ہوئے ہے، کرۂ ہوا یا کرۂ باد کہلاتا ہے۔ اس میں انسان اور جانور کے لیے آکسیجن جیسی حیات بخش گیسیں بھی شامل ہیں اور پودوں کے لیے کاربن ڈائی آکسائیڈ موجود ہے۔ یہ حرارت کو جذب کرکے بطور ایک سبز گھر (Green House) کے کام کرتا ہے۔ چنانچہ کسی سبز گھر کے شیشے کی طرح اشعاع لہر مختصر (Short wave radiation) اس میں داخل ہوکر زمین کی سطح تک پہنچ سکتی ہیں تو دوسری طرف یہ اشعاع ارضی (Terrestrial Radiation) کی طولی لہروں (Long Wave) کے لیے قریب قریب غیر متوازن ہو سکتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ سورج کی مہلک شعاعوں سے زمین کو محفوظ بھی رکھتا ہے۔ یہ آبی بخارات کا ذخیرہ بھی رکھتا ہے جس کی وجہ سے زمین اور سمندر دونوں پر یکساں طور پر تقطیر بارش (Precipitation) ہوتی ہے اور موجودہ دور میں کرۂ باد تیز تر ہوائی نقل وحمل کے لیے ایک واسطہ (Medium) کا کام انجام دیتا ہے۔ اس طرح کرۂ ارض ہوا اور پانی کی موجودگی کی وجہ سے نظام شمسی میں اپنے طرز کا ایک انوکھا سیارہ بن گیا ہے۔ کرۂ باد الگ الگ قسم کی مختلف گیسوں کا آمیزہ ہے۔ ان گیسوں کے نہایت باریک باریک مگر ٹھوس سالمات مختلف مقدار میں ہوا کے اندر پھیلے ہوتے ہیں۔ ان میں سے خالص خشک ہوا نائٹروجن کو ترتیب دیتی ہے جو 78 فیصد ہے۔ اور آکسیجن 21 فیصد بقیہ ایک فیصد دیگر کئی گیسوں کے لیے مخفی ہے جیسے آرگن (0.93 فیصد، کاربن ڈائی آکسائیڈ 0.03 فیصد) ہائیڈروجن اور اوزون (Ozone)۔ ان کے علاوہ آبی بخارات، دھول کے ذرات، دھواں، نمک اور دیگر غیر خالص اشیا بھی مختلف مقدار میں ہوا میں شامل ہیں۔ اس وجہ سے ہوائی ترکیب (Air Composition) کبھی مستقل نہیں رہ پاتی۔ کرۂ باد کے کئی اجزائے ترکیبی

میں کاربن ڈائی آکسائیڈ، دھول کے ذرات، آبی بخارات اور اوزون بڑی اہمیت کے حامل ہیں کیونکہ انھی پر زمین کی آب و ہوا کا دارومدار ہوتا ہے۔

ہوا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ اس کے کل حجم کا صرف 0.03 فیصد ہوتی ہے۔ اس کے باوجود موسمیاتی لحاظ سے اس کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ یہ جہاں کرۂ باد میں داخل ہونے والی شمسی شعاعوں کے لیے شفاف واسطہ کی حیثیت رکھتی ہے وہیں ارضی اشعاع کے لیے ایک غیر شفاف یا دھندلا واسطہ بن جاتی ہے جو کہ کرۂ باد سے خارج ہونے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ گیس ارضی اشعاع کے ایک حصے کو جذب کر لیتی ہے جسے بعد میں وہ اسے سطح زمین پر واپس بھیج دیتی ہے۔ اس طرح اس گیس کی وجہ سے زمین کے قریب کی ہوا گرم رہتی ہے اور جب اس میں پانی کے بخارات شامل ہو جاتے ہیں تو اس کے اثرات کرۂ باد میں بڑی حد تک سبز گھر یا شیشے کے گھر (Green House) جیسے ہو جاتے ہیں۔ دیگر گیسوں کے برخلاف کرۂ باد میں شامل کاربن ڈائی آکسائیڈ میں پچھلی چند دہائیوں سے مسلسل اضافہ ہوتا جا رہا ہے کیونکہ اس عرصے میں ایندھنوں کے جلنے میں کافی اضافہ ہوا ہے جس کی وجہ سے ہوا کے درجۂ حرارت میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

کرۂ باد کا ایک اہم جز اوزون گیس بھی ہے۔ یہ ایک چھلنی (Filter) کے طور پر کام کرتی ہے اور سورج کی بالائے بنفشی شعاعوں (Ultra-violet radiation) کو جذب کر لیتی ہے۔ لیکن یہ کرۂ باد میں نہایت قلیل مقدار میں پائی جاتی ہے۔ پھر ہوا میں اس کی تقسیم ہر جگہ مساوی بھی نہیں ہے بلکہ کہیں کم اور کہیں زیادہ ہے۔ یہ خصوصاً زمین سے کوئی 10 تا 50 کلومیٹر کے درمیان پائی جاتی ہے۔

کرۂ باد کے اندر پائی جانے والی تمام گیسوں میں آرگن (Argon) کا حجم تمام گیسوں پر غالب ہے۔ ان کے علاوہ ہوا میں نیون (Neon)، ہیلیم (Helium)، کرپٹن (Krypton) اور زینین (Xenon) جیسی گیسیں بھی پائی جاتی ہیں۔

آب و ہوا کی ساخت

کرۂ باد کی ساخت (Structure) کے بارے میں بھی تھوڑی روشنی ڈالنا ضروری ہے کیونکہ آب و ہوا کے پیٹرن میں تبدیلی کا اثر ان ہی پرتوں پر ہوتا ہے جس سے انسانی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ کرۂ باد ہوا کی ایسی پرتوں پر مشتمل ہوتا ہے جو تقریباً ہم مرکز تو ہوتی ہیں لیکن ان کی کثافت (Density) اور درجۂ حرارت (Temperature) مختلف ہوتے ہیں۔ سطح زمین کی ہوا میں کثافت سب سے زیادہ ہوتی ہیں مگر بلندی کی جانب اس میں تیزی سے کمی ہوتی جاتی ہے۔

کرۂ باد کو پانچ پرتوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی فضائی کرۂ متغیرہ (Troposphere)، فضائی کرۂ قائمہ (Stratosphere)، وسطی کرۂ باد (Mesosphere)، فضائی کرۂ برق باد (Lonosphere) اور بالائی کرۂ باد (Exosphere)۔

فضائی کرۂ متغیرہ (Troposphere) کرۂ باد کی سب سے نچلی پرت ہے جو سطح زمین سے بالکل متصل ہوتی ہے۔ قطبین کے قریب کی اونچائی کی وسعت کم و بیش آٹھ کلومیٹر ہوتی ہے جبکہ خط استوا پر تقریباً 18 کلومیٹر ہوتی ہے۔ ہوا کی اس پرت میں دھول کے ذرات کے ساتھ ساتھ زمین کے آبی بخارات کا 90 فیصد سے زیادہ حصہ شامل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ تمام اہم فضائی عمل جن سے آب و ہوا اور موسم میں تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، ہوا کی پرت میں واقع ہوتے ہیں۔ اسی لیے اس کو نہایت اہم سمجھا جاتا ہے۔ تاہم جیٹ ہوائی جہاز عموماً اس پرت کو پار کر کے اس کے اوپر پرواز کرتے ہیں کیونکہ اس میں اکثر خطرناک فضائی رخنے پائے جاتے ہیں جن سے حادثے کا خدشہ ہوتا ہے۔

فضائی کرۂ متغیرہ کے اوپر فضائی کرۂ قائمہ (Stratosphere) شروع ہوتا ہے۔ اس پرت کا ذیلی حصہ یعنی 20 کلومیٹر کی بلندی تک تو درجہ حرارت مستقل رہتا ہے لیکن اس کے بعد 50 کلومیٹر کی بلندی تک اس میں تدریجی اضافہ ہوتا ہے کیونکہ اس حصے میں اوزون گیس کی پرت ہوتی ہے جو سورج کی بالائے بنفشی (Ultra-Violet) شعاعوں کو جذب کر لیتی ہے۔ پھر اس میں بادل تقریباً نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ دھول اور آبی بخارات بھی بہت کم ہوتے ہیں۔ یہاں ہوا کا بہاؤ بھی تقریباً متوازی ہوتا ہے۔

فضائی کرۂ قائمہ کے اوپر تیسری پرت ہوتی ہے جسے وسطی کرۂ باد (Mesosphere) کہا جاتا ہے۔ اس کی بلندی 80 کلومیٹر تک ہوتی ہے۔ اس میں بھی حرارت بلندی کے ساتھ گھٹتی ہوئی 100 ڈگری سینٹی گریڈ تک پہنچ جاتی ہے۔ چوتھی پرت کو فضائی کرۂ برق باد (Lonosphere) کہا جاتا ہے جو 80 اور 400 کلومیٹر کے درمیان واقع ہے۔ یہ پرت برق بارشدہ ہوتی ہے۔ زمین سے جو تابکار لہریں (Radio Waves) ترسیل کی جاتی ہیں انھیں یہی لہر زمین پر دوبارہ منعکس کر دیتی ہے۔ سورج کی اشعاع حرارت کی وجہ سے اس میں بلندی کے ساتھ ساتھ درجۂ حرارت میں پھر اضافہ شروع ہو جاتا ہے۔

کرۂ باد کی سب سے بالائی پرت فضائی کرۂ برق بار کے اوپر شروع ہوتی ہے جس کی بلندی 400 کلومیٹر ہوتی ہے جسے بالائی کرۂ باد (Exosphere) کہا جاتا ہے۔ یہ پرت نہایت ہی لطیف شدہ (Rapefied) ہے اور بتدریج خلا میں ضم ہو گئی ہے۔

آب و ہوا کی ترکیب اور ساخت میں تبدیلی کی وجوہات اور اثرات

کرۂ باد کی ترکیب اور ساخت کا مطالعہ کرنے کے بعد ذہن میں سوال

اٹھتا ہے کہ آب و ہوا کے اس پیٹرن میں آج کل جو تبدیلیاں رونما ہو رہی ہیں جن سے انسانی زندگی، طرز زندگی، نباتات وحیوانات متاثر ہو رہے ہیں آخر اس کی سائنسی وجوہات کیا ہیں اور ان پر کس طرح قابو پایا جا سکتا ہے؟

صنعتی انقلاب کے بعد سے آب و ہوا کے Pattern میں بہت تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ ماحولیاتی اور صنعتی آلودگی دنیا کے بڑے مسائل میں سے ایک ہے۔ بڑے شہروں اور صنعتی علاقوں اور بجلی پیدا کرنے کے کارخانوں کے آس پاس آلودگی کا مسئلہ زیادہ سنگین ہے۔ صنعتوں نے آلودگی کم کرنے کی طرف سے اب تک بہت لا پرواہی برتی ہے جس سے ہماری زندگی بہت متاثر ہوتی جا رہی ہے کیونکہ انسانی صحت کے لیے صاف ماحول لازمی ہے۔

قبل اس کے کہ ہم اس موضوع کی تفصیل میں جائیں، سب سے پہلے یہ جاننا ضروری ہے کہ آلودگی سے کیا مراد ہے اور ہمارا ماحول صنعتوں سے کیسے آلودہ ہوتا ہے اور ہماری زندگی اس کثافت سے کیسے متاثر ہوتی ہے اور آب و ہوا کی ترکیب وساخت میں اس آلودگی سے کیسے تبدیلی واقع ہوتی ہے؟

آلودگی کے معنی ہیں گندگی، نجاست یا آلائش۔ لیکن اس کو ذرا وسعت دیں تو ہم کہہ سکتے ہیں دائرہ، حلقہ واردگرد کا ماحول آلودہ ہونا۔ یعنی ماحولیات کی ہر طرف موجودہ طبعیاتی اور نباتاتی مادیت کا اجتماع، اس زمرے میں ہوا، پانی اور زمین وغیرہ شامل ہیں جبکہ نباتاتی مادیت کے تحت پیڑ پودے، جنگل وغیرہ آتے ہیں۔ اس مادہ پرستی اور اقتصادی ترقی کی کشمکش کے دور میں انسان نے اصل مقصد اور اہمیت کو نظر انداز کر دیا ہے جس کی وجہ سے ترقی کے ذرائع، فروغ کے وسائل کی پیداوار کے ساتھ ساتھ ماحولیات میں مختلف قسم کے ناپسندیدہ عناصر کی مقدار بڑھتی جا رہی ہے جس کے نتیجے میں ماحولیات، طبعیاتی اور نباتاتی مادیت کے درمیان قائم شدہ توازن بگڑ رہا ہے۔ اس طرح ناپسندیدہ اور غیر ضروری عناصر کے شامل ہونے کی وجہ سے مختلف ماحولیاتی مادیت کا ناقص ہونا ہی آلودگی ہے۔ جن کے سبب خراب ہوا، گندہ پانی، ناقص آواز کی وجہ سے انسانوں میں ہونے والی بیماریاں، مرض میں مبتلا حیوانات، فنا ہوتی ہوئی بے شمار انمول جڑی بوٹیاں اور پودے اور حیوان کی نسلیں، جنگلوں کا فقدان، بارش کی کمی، زرخیز زمین کا بنجر ہونا جیسے نہایت تشویش ناک مسئلے ہمارے سامنے اژدہے کی مانند اپنے دہانے کھولے کھڑے ہیں۔

صنعتوں سے نکلنے والا دھواں، کاربن ڈائی آکسائیڈ، سلفر ڈائی آکسائیڈ، نائٹروجن آکسائیڈ نقصان دہ ہے اور کیمیا کی وجہ سے فضا ناقص ہو کر آب و ہوا کے پیٹرن پر اثر انداز ہوتی ہے۔ فضا میں کاربن ڈائی آکسائیڈ کی بڑھتی ہوئی مقدار سے کرۂ ارض پر قدرتی گیس کا توازن بگڑ رہا ہے۔

صنعتوں سے خارج ہونے والی نقصان دہ گیسوں میں سلفر ڈائی آکسائیڈ اور نائٹروجن کے آکسائیڈ کی غیر ضروری زیادتی کی وجہ سے یہ مادے بارش کے پانی سے مل کر تیزابی صورت اختیار کر لیتے ہیں جس سے بارش کا پانی تیزابی ہو جاتا ہے۔ اسے تیزابی بارش بھی کہتے ہیں۔

صنعت وحرفت میں استعمال ہونے والے کلورو فلورو کاربن اور دیگر گیسوں کے برے اثر سے کرۂ ہوا کی اوزون تہہ دن بہ دن ختم ہوتی جا رہی ہے۔ اوزون کی تہ کی وجہ سے سورج سے نکلنے والی ضرر رساں پیرا بیگنی کرنیں (Ultra-Violet Rays) کرۂ ارض پر پہونچ نہیں پاتیں کیونکہ اوزون گیس انھیں جذب کر لیتی ہے۔ ان پیرا بیگنی کرنوں کا انسان اور دیگر ذی روحوں پر برا اثر پڑتا ہے۔ اس سے جلدی سرطان (Skin Cancer) اور موتیا بند جیسی بیماریاں ہو سکتی ہیں۔ صنعتی آلودگی کی وجہ سے معدوم ہوتی ہوئی اوزون تہ سے ان ضرر رساں اثرات کا خدشہ بڑھتا جا رہا ہے اور صنعتوں سے کرۂ ہوا میں بکھرنے والے لوہ ذرات، معدنی ریزے یا فلزات کے نہایت باریک ذرے اور دیگر کیمیائی عناصر کے برے اثر سے مختلف قسم کے امراض متاثرہ علاقوں میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

ماحولیاتی آلودگی کا مطلب فضا میں Bio Gas Chemical اور Nutrient Cycle کا قائم ہونا ہے۔ ماحول میں سلفر ڈائی آکسائیڈ کی مقدار زیادہ ہونے سے پیڑ پودے اور حیوانات بہت متاثر ہو سکتے ہیں۔ پانی میں نائٹروجن اور فاسفورس کی زیادتی سے Oxygen Depleting Algal Blooms پیدا ہو جاتے ہیں جن سے پانی میں رہنے والے جاندار اور مچھلیوں وغیرہ کے ختم ہو جانے کا اندیشہ ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ شور کی آلودگی اور موٹر کاروں، بسوں اور انجنوں کے دھوئیں سے بھی ماحولیاتی آلودگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کے علاوہ صنعتی کچرا (Industrial Waste) اور نیوکلیر کچرا (Nuclear Waste) سے بھی Ecosystem یا ماحولیات اثر انداز ہوتا ہے جس سے فصلوں کی پیداوار، ماحولیاتی صفائی اور جغرافیائی محل وقوع پر بھی برا اثر پڑتا ہے۔

ہماری تیزی سے بڑھتی ہوئی آبادی اور تیزی سے بڑھتی ہوئی شہری زندگی گزارنے کی چاہت نے تو ہمیں بڑی بڑی صنعتیں، بڑے بڑے کارخانے، تیزی سے دوڑتی ہوئی موٹر گاڑیاں، چھوٹے بڑے خوبصورت گھر فراہم کیے مگر دوسری طرف ہماری صاف شفاف فضا میں انسان کی پیدا کردہ چیزوں یا گیسوں کو زیادہ مقدار میں جا ملایا اور ہماری فضا اور کرۂ باد کو آلودہ کر کے چھوڑا جو کہ اب خود انسانی زندگی کے لیے خطرہ بن گئی ہے۔

ہماری فضا میں کاربن مونو آکسائیڈ خاص طور پر دھواں اگلتی گاڑیوں سے نکلتی ہے۔ کاربن ڈائی آکسائیڈ کے بعد کاربن مونو آکسائیڈ ہی سب سے زیادہ آلودگی پھیلانے والی گیسوں میں ہے جو کہ مختلف مقدار میں مختلف شہروں میں فضا کو آلودہ کرنے لگی ہے۔ بڑے بڑے شہروں میں موٹر گاڑیاں کثیر تعداد

میں سڑکوں پر دوڑتی اور دھواں اگلتی ہیں جس سے کاربن مونو آکسائیڈ کا اخراج وہاں کی فضا میں لگاتار کافی مقدار میں ہوتا رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بڑے بڑے شہروں میں دردِسر کی شکایت عام طور سے ملتی ہیں۔

سلفر ڈائی آکسائیڈ ماحول کو آلودہ کرنے والی گیسوں میں سے ہے۔ یہ گیس ایندھن جلنے سے پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ گیس پانی کی اوپری سطح پر گھل جاتی ہے تو سلفورک عمل بن جاتی ہے۔ ندیوں کے کنارے واقع صنعتوں کے غیر ضروری فضلوں میں مرکری، سلیکن، کیڈمم، نکل، سلور جیسے معدن، سلفیٹ، نائٹریٹ، کلورائیڈ وغیرہ کاربونک نمک اور کاربونک کیمیا شامل ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ غیر ضروری ریڈیائی شعاعیں بھی ندی یا سمندر تک پہونچتی ہیں۔ ان صنعتی فضلوں کی وجہ سے ناقص پانی کو استعمال کرنے والے لوگوں کو پولیو، ڈائریا، آنتوں کا آشوب، آنتوں میں مروڑ، جلدی امراض وغیرہ ہوتے ہیں۔ اس میں پلنے والی مچھلیاں اور دوسرے جاندار بھی مختلف بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

آب و ہوا کے پیٹرن میں تبدیلی کی ایک اہم وجہ عالمی درجۂ حرارت میں اضافہ (Global Warming) ہے کرۂ باد میں جب کاربن ڈائی آکسائیڈ، کاربن مونو آکسائیڈ، میتھین وغیرہ گیسوں کی زیادتی ہو جاتی ہے تو وہ کرۂ ارض کی گرمی کو اپنے اندر جذب بھی کر لیتی ہیں اور واپس زمین کی طرف بھی بھیج دیتی ہیں۔ اس عمل کو Green house effect بھی کہا جاتا ہے۔ اس عمل سے کرۂ ارض کی آب و ہوا بہت گرم ہو جاتی ہے۔ ایسی صورت کو Global Warming کہا جاتا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ قدرتی آب و ہوا کے نمونے یا پیٹرن میں تبدیلی ہونے لگتی ہے۔ پہاڑوں پر جمی ہوئی برف اور گلیشیئر پگھلنے لگتے ہیں جس سے سمندری سطح میں اضافہ ہونے لگتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سیلاب آجاتا ہے اور ساحلی علاقوں کے شہر ڈوبنے لگتے ہیں۔ آبادی وہاں سے کھسک کر دوسری طرف آجاتی ہے۔ اور وہاں کی زائد آبادی پر مزید بوجھ بن جاتی ہے۔ اگر زمین کی حرارت اسی طرح بڑھتی رہی تو آرکٹک (Arctic) اور انٹارکٹک (Antarctic) کے عظیم قطعۂ برف کی چٹانیں پگھلیں گی جس کے نتیجے میں سمندر کی آبی سطح بے انتہا بڑھ جائے گی اور ساحلی شہروں اور علاقوں کا وجود یکسر ختم ہو جانے کا خطرہ پیدا ہو جائے گا۔

عالمی درجۂ حرارت میں مزید اضافے سے بارش پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے۔ سمندروں میں طوفانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت زیادہ پانی سمندروں میں چلا جاتا ہے اور صاف پینے کے پانی کی کمی ہو جاتی ہے۔ درجۂ حرارت کے بڑھ جانے سے زراعت پر بہت برا اثر پڑتا ہے۔ اگر دو ڈگری درجۂ حرارت بھی بڑھ جائے تو گیہوں پیدا کرنے والے علاقے (Wheat Belt) کے تباہ ہونے کا خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ درجۂ حرارت کے بڑھنے سے کرۂ باد کی مختلف تہوں پر بھی اثر پڑتا ہے۔ کیمیائی اثرات اور صنعتی آلودگی کے نتیجے میں بھی آب و ہوا کے نمونے پر تبدیلی کے آثار نظر آتے ہیں۔ کرۂ باد کی اوزون تہہ میں انھی کیمیائی اجزا نے سوراخ کر دیا ہے جس سے سورج کی پیرابیگنی کرنیں زمین پر آنے لگتی ہیں اور انسانی زندگی کو خطرہ پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ آب و ہوا کے نمونے میں تبدیلی کی بڑی وجہ خود انسان ہے جس نے جنگلات کو کاٹ کر ختم کر دیا ہے جس سے کئی طرح کے مسائل سامنے آرہے ہیں۔ ان کے نہ رہنے سے نہ صرف مٹی کا کٹاؤ ہوتا ہے بلکہ زراعت کے لیے بھی خطرہ پیدا ہو گیا ہے خاص طور سے نشیب میں واقع علاقوں کی نسلیں بھی بے حد متاثر ہوتی ہیں۔ سیلاب سے زمین کو بہت نقصان ہوتا ہے اور کھیتی تباہ ہو جاتی ہے۔ یہ صرف جنگلات ہی ہیں جو سیلاب کی تیز روانی کا رخ موڑ دیتے ہیں یا ان کو کمزور کر دیتے ہیں اور فصلوں کو تباہ ہونے سے بچا لیتے ہیں۔

مٹی کے کٹاؤ (Soil erosion) کے ذمہ دار عناصر بارش، سیلاب اور تیز ہوائیں ہیں۔ اگر کسی علاقے میں جنگلات ہوں تو یہ کاٹ چھانٹ کم ہو جاتی ہے۔ جنگلات مٹی کو ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے سے روکتے ہیں۔ اس مٹی میں بعد میں ہرے بھرے گھاس کے میدان تیار ہو جاتے ہیں جو جانوروں کی چراگاہ کے طور پر استعمال ہو سکتے ہیں۔

صنعت کو ترقی دینا کوئی غلط بات نہیں ہے۔ اس سے کسی ملک کی خوشحالی ظاہر ہوتی ہے مگر صنعت کاروں کو احتیاطی تدابیر استعمال کرنا چاہیے تاکہ کرۂ باد میں کیمیائی گیسیں پہنچ کر انھیں نقصان نہ پہنچائیں۔ قدرت سے چھیڑ چھاڑ کا نتیجہ سوائے تباہ کاری کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ کرۂ باد کی ترکیب و ساخت کو چھیڑنے کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ اس سلسلے میں کئی عالمی کانفرنسیں منعقد کی گئیں تاکہ فضائی آلودگی کو ختم کیا جائے۔ حال ہی میں Rio De Janero میں ایک عالمی کانفرنس ہوئی جس میں طے کیا گیا کہ فضائی آلودگی ختم کرنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ صنعتوں سے پھیلنے والی آلودگی پر پوری طرح قابو پاکر ہی صنعت کا قیام اور فروغ ہو تاکہ آلودگی کا انسداد ہو سکے۔ ترقی اور فطرت کا توازن برقرار رہے اور ممالک ترقی کی راہ پر گامزن ہوتے رہیں۔ اسی میں ہم سب کی بھلائی ہے۔

□□□

46 - Neshat Apartment
Near Shamshad Market
AMU, Aligarh (U.P.)

حکیم اشہر قدیر

گردوں کی حفاظت

گردوں کا شمار بھی جسم کے اہم اعضا میں ہوتا ہے۔ یہ چوبیسوں گھنٹے فعال رہتے ہیں اور ان کے ذریعے جسم میں پیدا ہونے والے مضر مادے بصورت پیشاب خارج ہوتے ہیں۔ اگر کسی وجہ سے گردوں کا فعل متاثر ہو جائے تو پیشاب بھی کم خارج ہوتا ہے اور مضر مادوں کا جسم میں اجتماع ہونے کے باعث مختلف عوارضات بھی پیدا ہو جاتے ہیں جو جسم کے لیے مضر اور بعض اوقات مہلک بھی ثابت ہو سکتے ہیں۔

گردوں کے فعل کی درستگی کا اندازہ پیشاب کی یومیہ مقدار سے لگایا جا سکتا ہے۔ ایک نوجوان آدمی 24 گھنٹے میں ڈیڑھ سے دو لیٹر پیشاب خارج کرتا ہے۔ اگر اس مقدار میں کمی لاحق ہو جائے اور ایک لیٹر سے کم پیشاب خارج ہو تو سمجھا جاتا ہے کہ گردے اپنا فعل ٹھیک طرح سے انجام نہیں دے رہے ہیں۔

موسم سرما میں پیشاب بکثرت خارج ہوتا ہے۔ اس کے برعکس موسم گرما میں پیشاب قدرے قلت سے خارج ہوتا ہے۔ دراصل پیشاب کی مقدار کا دارومدار دو چیزوں پر ہوتا ہے۔ اول تو یہ کہ جسم میں پانی کی مقدار کتنی ہے اور دوسرے یہ کہ گردے پوری طرح درست اور فعال ہیں یا نہیں۔ اگر جسم میں پانی کی مقدار طبعی سے کم ہے تو پیشاب بھی کم خارج ہوگا خواہ گردے تندرست اور فعال ہوں اور اگر جسم میں پانی کی کوئی کمی نہ ہو لیکن کسی مرض میں مبتلا ہونے کی وجہ سے گردے پوری طرح کام نہیں کر رہے ہیں تو ایسی صورت میں بھی پیشاب کی مقدار میں کمی ہو جائے گی۔ گرمی اور سردی میں پیشاب کی مقدار میں تبدیلی کا باعث جسم میں موجود پانی اور اس کا میلان ہے۔ جسم میں پانی کی مقدار پانی اور دیگر مشروبات نیز رطب اغذیہ کے استعمال پر منحصر ہوتی ہے۔ چونکہ موسم سرما میں گرما کے مقابلے پانی کم پیا جاتا ہے اور رطب اغذیہ کا استعمال بھی کم ہوتا ہے اور موسم گرما میں پانی زیادہ پیا جاتا ہے اور رطب اغذیہ بھی بکثرت استعمال ہوتی ہیں اس لحاظ سے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ سردی میں گرمی کے مقابلے پیشاب کی مقدار کم ہو لیکن ہوتا بالکل برعکس ہے یعنی سردی میں گرمی کے مقابلے پیشاب زیادہ خارج ہوتا ہے۔ لہٰذا اس تضاد کی وجہ جسم میں پانی کی مقدار نہیں بلکہ پانی کا میلان ہے۔

پانی منہ کے ذریعے جسم میں داخل ہوتا ہے اور مطلوبہ افعال انجام دینے کے بعد مختلف راستوں سے جسم سے خارج ہو جاتا ہے۔ جیسے گردہ سے پیشاب کی شکل میں، بذریعہ امعا براز کے ہمراہ، بذریعہ جلد پسینہ کی شکل میں، بذریعہ چشم آنسو کی شکل میں، بذریعہ دہن لعاب کی شکل میں اور بذریعہ آبخارات۔ ان میں سے سب سے زیادہ فعال راستے گردہ اور جلد ہیں۔ لہٰذا سردی کے موسم میں پانی کا زیادہ میلان گردوں کی طرف ہوتا ہے اور وہاں سے گردوں کے ذریعے جذب ہو کر یہ پیشاب کی صورت خارج ہوتا ہے۔ لیکن گرمی کے موسم میں بدنی حرارت کو اعتدال میں رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ جلد سے پسینہ خارج ہو۔ چنانچہ پسینے کی تولید اور اخراج کے لیے پانی کا میلان جلد کی جانب ہو۔ گردوں اور جلد دونوں کی جانب پانی کا میلان اور اس کے نتیجے میں ہونے والی تقسیم گرمیوں میں پیشاب کی قلت کا باعث ہوتی ہے۔

ہمارے ملک میں اپریل سے ستمبر تک موسم گرم رہتا ہے۔ بالخصوص جولائی، اگست اور ستمبر میں کہ جب برسات شروع ہو جاتی ہے، گرمی کے ساتھ ہوا میں نمی بھی شامل ہو جاتی ہے اور ان دنوں پسینہ کثرت سے خارج ہوتا ہے۔ غرض کہ یہی وہ زمانہ ہے کہ جب جسم میں پانی کا میلان گردوں کی طرف کم ہو جاتا ہے اور گردوں سے پیشاب کا اخراج بھی کم ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں پیشاب کا قوام بھی غیر معتدل یعنی غلیظ ہو جاتا ہے۔ پیشاب کی کمیت اور کیفیت میں یہ تبدیلی گردوں کی صحت پر براہ راست اثر انداز ہوتی ہے۔ وہاں مضر مادوں کا اجتماع ہونے لگتا ہے۔ ایسی صورت میں گردوں کی بہت عام بیماری سنگ گردہ کے پیدا ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں نیز گردوں کے اندر پائی جانے والی باریک نالیاں مادوں کے اجتماع سے تنگ اور مسدود ہونے لگتی ہیں۔ جس سے گردے کی ساخت اور فعل دونوں متاثر ہوتے ہیں۔

گردوں کو مذکورہ عوارض سے بچانے کے لیے ضروری ہے کہ خواہ موسم کوئی بھی ہو گردوں سے پیشاب وافر مقدار میں خارج ہونا چاہیے۔ ایک عام آدمی کے لیے یہ شمار کرنا قدرے مشکل ہے کہ وہ یومیہ کتنا پیشاب خارج کر رہا ہے اور یہ اندازہ لگانا بھی دشوار ہے کہ پیشاب کا قوام معتدل ہے کہ نہیں۔ اس کے لیے ایک آسان طریقہ یہ ہے کہ پیشاب کے رنگ سے استدلال کیا جائے۔ پیشاب کا طبعی رنگ سفید مائل بہ زردی ہوتا ہے۔ جب پیشاب کی مقدار طبعی سے گھٹ جاتی ہے تو اس کا رنگ بھی تبدیل ہونے لگتا ہے اور پیشاب جتنا قلیل المقدار اور غلیظ ہوگا اتنا ہی اس کا رنگ زرد سے زعفرانی ہوتا

چلا جاتا ہے۔ یہ بات ہر شخص کے تجربے میں ہے کہ سخت گرمی کے موسم میں جب پسینہ بکثرت خارج ہوتا ہے تو پیشاب کی حاجت بہت کم ہوتی ہے اور جب ہوتی ہے تو پیشاب کم مقدار میں گہرے زرد یا زعفرانی رنگ کے ساتھ خارج ہوتا ہے۔ بعض اوقات پیشاب اتنا غلیظ اور ردی مادوں سے پُر ہوتا ہے کہ اخراج کے وقت جلن محسوس ہوتی ہے۔ اور اگر یہ صورت قائم رہے تو گردوں پر بہت ہی برا اثر پڑتا ہے۔

ان حالات سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ پیشاب کی مقدار بڑھائی جائے۔ مقدار بڑھنے کے نتیجے میں پیشاب کا قوام اور رنگ دونوں درست ہو جاتے ہیں۔ موسم گرما میں پیشاب کی مقدار کو بڑھانے کا واحد ذریعہ جسم میں پانی کی مقدار کو بڑھانا ہے تاکہ اگر پسینے کی وجہ سے پانی کا کچھ حصہ جلد کی طرف مائل ہو بھی جائے تو پانی کی کثرت کے باعث گردوں کی طرف پانی کے سیلان میں فرق نہ آئے۔ طبعی کمیت اور کیفیت کے ساتھ گردوں سے پیشاب کا اخراج جاری رہے۔ جسم میں پانی کی مقدار بڑھانے کا سب سے موثر طریقہ پانی زیادہ پینا ہے۔ پانی کے علاوہ دیگر مشروبات جیسے شربت، لسّی، مٹھا اور ٹھنڈی مشروبات وغیرہ کا استعمال بھی بڑھایا جائے۔ گرمیوں کے پھل اور سبزیاں جیسے تربوز، خربوز، کھیرا، ککڑی، ٹنڈا، توری، پرول وغیرہ کثرت سے کھایا جائے علاوہ ازیں پانی میں چینی اور لیموں ڈال کر پینا۔ اسی طرح ایک شربت ''شربت بزوری معتدل'' کے نام سے یونانی دوا فروش کے یہاں دستیاب ہوتا ہے۔ صبح و شام 30-30 ملی لیٹر پانی میں ڈال کر پینے سے پیشاب کثرت سے خارج ہوتا ہے۔

اگر کہیں ایسے حالات پیدا ہو جائیں کہ پانی یا دیگر کوئی مشروب طویل عرصے تک نصیب نہ ہو جیسے سفر کے دوران یا روزہ کی حالت میں تو اس وقت پیشاب بھی کم خارج ہوگا۔ ایسی صورت میں پانی یا کوئی دوسرا شربت میسر آجائے تو خوب افراط سے پینا چاہیے۔ یہ عمل اختیار کرنے سے گردوں کو بہت فائدہ ہوتا ہے۔ وہ فعال ہو جاتے ہیں اور وہاں مضر مادوں کے اجتماع کا امکان بھی معدوم ہو جاتا ہے یعنی گردے پوری طرح دھل جاتے ہیں۔ اگر پیشاب کا رنگ زرد ہونے لگے تو زیادہ پانی پی کر اس کو طبعی رنگ پر لے آئیں۔ بس اتنی سی احتیاط برتنے سے ہم اپنے جسم کے انتہائی اہم اور بیش قیمت عضو گردہ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔

□□□

A/157, Ghaffar Manzil
Jamia Nagar
New Delhi-110025

خطبات آزادی (حصہ اوّل)

1921 سے 1946 کے درمیان کانگریس کے 17 اہم جلسے ہوئے جن کی صدارت حکیم اجمل خاں سی. آر. داس، محمد علی جوہر، مولانا ابوالکلام آزاد، مہاتما گاندھی، سروجنی نائیڈو، مختار احمد انصاری، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو اور سبھاش چندر بوس جیسے قومی رہنماؤں نے کی۔ اس کتاب میں آزادی سے قبل کانگریس کے جلسوں میں پیش کیے گئے تمام صدارتی خطبے جمع کر دیے گئے ہیں۔

صفحات: 580، قیمت -/200 روپے

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (جلد اول)

مصنف: چارلس ڈکنس

مترجم: فضل حسنین

انگریزی کے عظیم ناول نگار چارلس ڈکنس کے ناول ڈیوڈ کاپر فیلڈ کو عالمی کلاسک کا درجہ حاصل ہے۔ اردو میں پہلی بار اس کا ترجمہ شائع کرنے کا شرف کونسل کو حاصل ہے۔ مترجم نے بے حد سادہ اور عام فہم زبان میں اس ناول کو اردو کا قالب عطا کیا ہے۔

صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔
تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-110 066

کمال احمد صدیقی

کشمیر — محبتوں کی سرزمین

کشمیر، ازمنہ وسطیٰ سے مذاہب اور فکری دھاروں کا میدانِ جنگ نہیں، مذاہب اور فکری دھاروں کا نگار خانہ رہا ہے۔ کشمیر کے لوگ طبعاً امن پسند تھے، اور ہیں حالات نے، جن پر ان کا قابو نہیں، انھیں دہشت گرد نہیں، دہشت گردی، بلکہ وحشت گردیوں کا شکار بنا دیا ہے۔ میں نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ، نوجوانی سے جوانی کے اختتام تک، تیس برس کا عرصہ دنیا کے سب سے خوبصورت علاقے کشمیر میں، دنیا کے سب سے زیادہ مہذب لوگوں کے ساتھ گزارا ہے۔ کشمیر کی یاد آتی ہے، تو دل میں اک ہوک سی اٹھتی ہے۔ جب میں پچھلی صدی کے دوسرے نصف کے شروع میں کشمیر گیا تھا، تو وہاں قبائلی نظام تو نہیں تھا لیکن شہر، مضافات اور دیہاتوں میں بہت زیادہ فرق نہ تھا۔ کہنے کو تو تین شہر تھے: سرینگر، اننت ناگ اور بارہ مولہ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شہر ہونے کے کچھ آثار صرف سرینگر کے چند علاقوں میں تھے۔ ورنہ ساری وادیٔ کشمیر ایک اکائی تھی اور ہنگاموں سے دور، مضافات اور دیہی علاقوں کی طرف لوگ زیادہ کھنچتے تھے۔ آج تو خیر شہر پن زیادہ ہو گیا ہے۔ پچاس برس پہلے تک شہر کے اندر دیہات تھے۔

امیر گنتی کے تھے لیکن سماجی عزت اور احترام، گُن اور اوصاف تھے۔ سرکاری ملازموں کے بہت ہی چھوٹے گروہ کو چھوڑ کر باقی سب موسم کے رحم و کرم پر ہوتے تھے۔ دو مہینے بہار، دو مہینے گرمی اور ایک مہینے خزاں کو چھوڑ کر، کیا تاجر، کیا کسان، سب کے پاس وقت ہی وقت ہوتا۔ ہاں کشمیر میں تین موسم نہیں، چار موسم ہوتے ہیں۔ تین چلوں والا جاڑا، چلہ کلاں، چلہ خورد اور ایک چلہ بچہ۔

آبادی کا ایک حصہ وادی سے باہر چلا جاتا تھا۔ ملازمت اور روزگار کے سلسلے میں سرکاری دفاتر سرینگر کے جاڑوں کے آغاز میں، جموں چلے جاتے تھے۔ بہت سے کاروباری بھی جموں، امرتسر، دلّی بلکہ سارے ملک کے بڑے بڑے شہروں میں کشمیر میں بنی ہوئی شالیں، نمدے، گبھے، پیپر ماشی اور اخروٹ کی لکڑی پر نقاشی کی چیزیں لے کر کچھ پھیری لگاتے تھے، کچھ نے دوکانوں سے کاروباری رشتے بنا لیے تھے۔ بڑی آبادی کشمیر کے محنت کش مزدوروں کی امرتسر، اور پنجاب کے دوسرے شہروں میں ہجرت Migrate کر جاتی تھی۔ شملہ، لدھیانہ، جالندھر میں ان کی بڑی مانگ تھی۔ اور کچھ محلّوں میں ان کی رہائش کے مرکز بن گئے تھے۔

پیسہ ساری دنیا میں بولتا ہے۔ کشمیر میں بھی پیسہ بولتا تھا اور اب بھی بولتا ہے۔ لیکن نصف صدی سے کچھ برس پہلے میں کشمیر گیا تو وہاں میں نے پایا کہ وہاں سب سے زیادہ احترام عالموں کا، شاعروں کا، لکھنے والوں کا، اور مذہبی پیشواؤں کا ہوتا تھا۔ عالموں میں برگزیدہ استادوں کا ایک اعلیٰ مقام تھا۔ کچھ سیاسی رہنماؤں کا بھی بڑا مرتبہ تھا۔

اس زمانے میں ہر شاعر کو صوفی سمجھا جاتا تھا اور عام لوگ برکت کی تلاش میں ان سے دعائیں کرانے آتے تھے۔ خواتین اپنے ننھے منے بچوں کو پھونک دلواتی تھیں۔

کشمیری پنڈت فرقہ، کشمیر میں آبادی کے لحاظ سے اقلیت، اور وہ بھی چھوٹی سی اقلیت تھا۔ لیکن سماج میں اس کی حیثیت وہ تھی جو جوہر (Atom) میں مرکزے کی ہوتی ہے۔ تعلیمی اعتبار سے ان کا مقام وہ تھا جو ابلے ہوئے دودھ پر ملائی کا ہوتا ہے۔ جو نہ جانتے ہوں وہ پنڈت اور مسلمان میں تمیز نہیں کر سکتے تھے۔ علم، ادب، خاص طور سے نثر میں ان کا بڑا Contribution تھا۔ کشمیر جانے سے پہلے میں مجبور اور نظم جوگی کے خالق خوشی محمد ناظر یوگ دان کے نام جانتا تھا لیکن پریم ناتھ پردیسی اور اپورب سومناتھ کے نام سے زیادہ واقف تھا۔ محمود ہاشمی کاشمیری کے رپورتاژ آتش چنار کی وجہ سے جو، صمد شاہین اور ممتاز شیریں نے تقسیم کے بعد ''نیا دور'' میں چھاپا تھا، جس میں میری نظمیں بھی چھپتی تھیں۔ کشمیر کا پنجاب، خاص طور سے لاہور سے تعلیم، ادب اور صحافت کے سلسلے میں گہرا رشتہ تھا۔ کشمیر کے کالج پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ تھے۔ وادیٔ کشمیر کو بانہال سے راولپنڈی اور لاہور سے سڑک کے راستے سے جڑی ہوئی تھی۔ جموں اور سیالکوٹ کے درمیان ریل لائن تھی، اور اتنے قریب ایک دوسرے سے یہ شہر تھے کہ شاید ٹکٹ چار آنے تھا اور یہاں کے لوگ سنیما دیکھنے سیالکوٹ جایا کرتے تھے۔

بات کر رہا تھا میں کشمیر کی ادبی اور ثقافتی فضا کی۔ یہ بات ہے 1954 کے آس پاس کی۔ میرے پروگرام سکریٹری جگن ناتھ بزاز نے ایک روز مجھ سے کہا ''ماسٹر زندہ کول نے آپ سے ملنے کے لیے وقت مانگا ہے'' میں نے کہا ''جب جی چاہے آ جائیں۔ دفتر میں، چاہے گھر پر۔'' پھر مجھے خیال آیا کہ زندہ کول شاعر ہی نہیں، استاد بھی ہیں۔ پریم ناتھ پردیسی، ڈی پی

دھر اور دینا ناتھ نادم نے ان کا ذکر کیا تھا۔ میں نے پوچھا کہ ان کی عمر کیا ہے؟ بزاز نے بتایا کہ یہی کوئی ستر کے آس پاس۔ میں نے کہا ''وہ نہ آئیں مجھے ہی ان کا پتہ بتاؤ' میں خود جاؤں گا ملنے''۔ اگلے روز پیغام آیا کہ نہیں، وہ خود آئیں گے اگلے روز۔ اسی وقت میں نے ریڈیو کی گاڑی لی اور ان سے ملنے چلا گیا۔ مشہور شخصیت تھے۔ مکان تک پہنچنے میں دشواری نہیں ہوئی۔ میں نے اپنا تعارف کرایا تو کسی قدر حیرت سے انھوں نے دیکھا اور فرمایا ''ہم تو دس برس سے آپ کی نظم اور نثر لاہور اور دلّی کے رسالوں میں پڑھتے رہے ہیں۔ آپ کی نظموں کا مجموعہ' بادبان'' بھی چار پانچ برس پہلے آیا تھا۔ آپ وہی ہیں'' میں نے عرض کیا'' وہی ہوں۔ بہت خوش ہوئے اور دعائیں دیں۔ اٹھتے بیٹھتے مثنوی مولانا روم کے اشعار پڑھتے تھے۔ معلوم ہوا مثنوی کے اشعار کا ورد عبادت میں بھی کرتے ہیں'' سمرن'' ان کی منظومات کا مجموعہ ہے جس پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ بھی ملا۔ ماسٹر زندہ کول کی طرح ایک اور اہم عالم ماسٹر شنکر پنڈت بھی تھے۔ 1966 کا ذکر ہے۔ انھوں نے ملنے کے لیے کہلوایا۔ ان سے ملنے گیا۔ گاؤ کدل سے تھوڑا فاصلے پر جہلم کے داہنے کنارے کے پاس ان کا مکان تھا، قدیم طرز کا۔ شیو بھگت تھے۔ وہاب کھار کا یہ مصرعہ ورد زبان رہتا تھا'' ہر مکھ چھو دیدار'' ایک مسلمان شاعر وہاب کھار (خار) کی مسلسل غزل کا یہ کلیدی مصرع ہے۔ اس میں ایہام ہے۔ ہر مکھ میں تیرا دیدار، ہر چہرے میں تیرا دیدار کرتا ہوں۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ تیرا دیدار ہر مکھ پہاڑ کی چوٹی پر ہوا۔ کشمیر شیومت کا ایک اہم مرکز ہے۔ آدی شنکر آچاریہ، جنھوں نے چار مٹھ بنائے تھے، کشمیر بھی گئے تھے، اور شنکر آچاریہ پہاڑی، جو شنکر کے نام پر ہے، اور سرینگر میں ڈل (جھیل) کے کنارے ہے، وہاں بھی گئے تھے۔ کشمیر کا شیومت جنوب کے شیومت سے مختلف ہے۔ کشمیر کے شیومت میں شکتی کو بھی اہمیت' اور بنیادی اہمیت' حاصل ہے۔ شکتی ایک نام پاروتی کا ہے۔ کشمیر میں کئی مقامات شیو اور پاروتی سے منسوب ہیں۔ جہاں کے کئی سرچشمے ہیں، اور نیلی مت پران کے مطابق، یہ شنکر کے ترشول کے گرنے سے جاری ہوئے۔ اور جہلم دریا' پاروتی ہی کا روپ ہے۔ شیش ناگ سے اوپر امر ناتھ کی گپھا، جہاں ہر سال ہزاروں شردھالو لنگ، شیو لنگ کی زیارت کے لیے جاتے ہیں، اسے ایک مسلمان گوجر نے دریافت کیا تھا۔ امر ناتھ کے یاتریوں کے لیے انتظامات کشمیری مسلمان ہی کرتے ہیں۔ اور وہاں امرناتھ گپھا میں جو چڑھاوے چڑھتے ہیں، اس کا حصہ اس مسلمان گوجر خاندان کو بھی ملتا ہے۔

کشمیر کی سب سے مقدس اور متبرک صوفیہ، کشمیری مسلمانوں اور کشمیری پنڈتوں میں یکساں ہر دلعزیز ہیں۔ ایک کشمیری پنڈت گھرانے میں پیدا ہوئی تھیں اور للّہ ایشوری ان کا نام تھا۔ پنڈت اسے للّہ دید کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ لیکن مسلمان عقیدت مند انھیں للّہ عارفہ کہتے ہیں۔ شنکر کی بھگت تھیں۔ ان کے واکھ یکساں عقیدت سے کشمیری مسلمان او رکشمیری پنڈت گھرانوں میں پڑھے جاتے ہیں۔

کشمیر کے ایک بڑے صوفی نورالدین نورانی ہیں ان کا کلام بھی عقیدت سے مسلمان اور پنڈت پڑھتے ہیں۔ چرارشریف میں ان کی درگاہ ہے جہاں دونوں فرقوں کے عقیدت مند جاتے ہیں۔ نندرشی (بابا نورالدین) کے لقب سے مشہور ہیں۔ ان کے عقیدت مند گوشت نہیں کھاتے اور جو گوشت کھاتے بھی ہیں وہ ان کے عرس کے دنوں میں یا جب وہ درگاہ جاتے ہیں تو گوشت کھا کے نہیں جاتے۔

ایک روایت ہے کہ جب وہ پیدا ہوئے تو انھوں نے اپنی ماں کے دودھ کو منہ نہیں لگایا۔ بڑے جتن کیے گئے، لیکن بچے نے دودھ منہ میں نہیں لیا۔ اتنے میں للّہ دید ادھر سے گزریں، اور لوگوں نے انھیں کچھ اپائے کرنے کے لیے گزارش کی۔ للّہ دید یعنی للّہ ایشوری، یعنی للّہ عارفہ گھر میں آئیں بچے کو سینے سے لگایا اور کہا'' جب دنیا میں آتے شرم نہیں آئی تو ماں کے دودھ سے کیا پرہیز۔'' بچے نے دودھ پینا شروع کر دیا۔

للّہ دید اور نندرشی کا نام کشمیر میں ساتھ ساتھ لیا جاتا ہے۔ کشمیری کے جن شاعروں کے کلام کے ترجمے میں نے کیے ہیں، ان میں للّہ عارفہ یا للّہ ایشوری یا للّہ دید بھی ہیں۔ میں نے کئی واکھوں کو ایک نظم کے بار میں گوندھا ہے۔ ایک واکھ ملاحظہ کیجیے۔:

شیخ اور برہمن میں فرق نہ کر
شیو شنکر ہے ہر جگہ موجود
خود کو پہچان — ہر اک دانا
ہے یہی صرف قربت معبود!

(2)

اس نے مجھ پہ تراشے ہیں سیکڑوں الزام
نہ ہوگی ان سے بھی نفرت کبھی مرے دل میں
زمانہ مجھ پہ ہنسے بھی تو اس سے کیا ہوگا
کہ میرے ساتھ مرا مہربان شنکر ہے

□□□

A-295
New Friends Colony
New Delhi-110065

احمد ندیم قاسمی

پرمیشر سنگھ

اختر اپنی ماں سے یوں اچانک بچھڑ گیا جیسے بھاگتے ہوئے کسی جیب سے روپیہ گر پڑے۔ ابھی تھا اور ابھی غائب۔ ڈھنڈیا پڑی مگر بس اس حد تک کہ لٹے پٹے قافلے کے آخری سرے پر ایک ہنگامہ صابن کی جھاگ کی طرح اٹھا اور بیٹھ گیا۔ "کہیں آ ہی رہا ہوگا۔" کسی نے کہہ دیا "ہزاروں کا تو قافلہ ہے" اور اختر کی ماں اس تسلی کی لاٹھی تھامے پاکستان کی طرف رینگتی چلی آئی تھی۔ "آ ہی رہا ہوگا" وہ سوچتی "کوئی تتلی پکڑنے نکل گیا ہوگا اور پھر ماں کو نہ پا کر رویا ہوگا اور پھر۔ پھر اب کہیں آ ہی رہا ہوگا۔ سمجھ دار ہے پانچ سال سے تو کچھ اوپر ہو چلا ہے۔ آ جائے گا وہاں پاکستان میں ذرا ٹھکانے سے بیٹھوں گی تو ڈھونڈ لوں گی۔"

لیکن اختر تو سرحد سے کوئی پندرہ میل دور اُدھر یونہی بس کسی وجہ کے بغیر اتنے بڑے قافلے سے کٹ گیا تھا۔ اپنی ماں کے خیال کے مطابق اس نے تتلی کا تعاقب کیا یا کسی کھیت میں سے گنے توڑنے گیا اور توڑتا رہ گیا۔ بہر حال وہ جب روتا چلاتا ایک طرف بھاگا جا رہا تھا تو سکھوں نے اسے گھیر لیا تھا اور اختر نے طیش میں آ کر کہا تھا "میں نعرۂ تکبیر ماروں گا" اور یہ کہہ کر سہم گیا تھا۔

سب سکھ بے اختیار ہنس پڑے تھے، سوائے ایک سکھ کے، جس کا نام پرمیشر سنگھ تھا۔ ڈھیلی ڈھالی پگڑی میں سے اس کے الجھے ہوئے کیس جھانک رہے تھے اور جوڑا تو بالکل ننگا تھا۔ وہ بولا "ہنسو نہیں یارو، اس بچے کو بھی تو اس واہگورو نے پیدا کیا ہے جس نے تمھیں اور تمھارے بچوں کو پیدا کیا ہے۔"

ایک نوجوان سکھ جس نے اب تک اپنی کرپان نکال لی تھی، بولا "ذرا ٹھہر پرمیشر" کرپان اپنا دھرم پورا کر لے، پھر ہم اپنی دھرم کی بات کریں گے۔"

"مارو نہیں یارو" پرمیشر سنگھ کی آواز میں پکار تھی۔ اسے مارو نہیں اور وہ بری طرح ہانپ رہا تھا۔

اختر کے پاس آ کر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور بولا۔

"نام کیا ہے تمھارا؟"

"اختر"...... اب کی اختر کی آواز بھرائی ہوئی نہیں تھی۔

"اختر بیٹے" پرمیشر سنگھ نے بڑے پیار سے کہا۔

"ذرا میری انگلیوں میں جھانکو تو"

اختر ذرا سا جھک گیا۔ پرمیشر سنگھ نے دونوں ہاتھوں میں ذرا سی جھری پیدا کی اور فوراً بند کر لی "آہا" اختر نے تالی بجا کر اپنے ہاتھوں کو پرمیشر سنگھ کے ہاتھوں کی طرح بند کر لیا اور آنسوؤں میں مسکرا کر بولا۔ "تتلی"

"لوگے؟" پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

"ہاں" اختر نے اپنے ہاتھوں کو ملا۔

"لو" پرمیشر سنگھ نے اپنے ہاتھوں کو کھولا۔ اختر نے تتلی کو پکڑنے کی کوشش کی مگر وہ راستہ پاتے ہی اڑ گئی اور اختر کی انگلیوں کی پوروں پر اپنے پروں کے رنگوں کے ذرے چھوڑ گئی۔ اختر اداس ہو گیا اور پرمیشر سنگھ دوسرے سکھوں کی طرف دیکھ کر بولا "سب بچے ایک سے کیوں ہوتے ہیں یارو! کرتارے کی تتلی بھی اڑ جاتی تھی یوں ہی منھ لٹکا لیتا تھا ..."

"پرمیشر سنگھ تو آدھا پاگل ہو گیا ہے۔" نوجوان سکھ نے ناگواری سے کہا اور پھر سارا گروہ واپس جانے لگا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور جب اسی طرف چلنے لگا جدھر دوسرے سکھ گئے تھے تو اختر پھڑک پھڑک کر رونے لگا "ہم اماں پاس جائیں گے۔ اماں پاس جائیں گے" پرمیشر سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھپکنے کی کوشش کی مگر اختر نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا پھر جب پرمیشر سنگھ نے اس سے یہ کہا کہ "ہاں ہاں بیٹے" تمھیں تمھاری اماں پاس لیے چلتا ہوں۔ تو اختر چپ ہو گیا۔ صرف کبھی کبھی سسک لیتا تھا اور پرمیشر سنگھ کی تھپکیوں کو بڑی ناگواری سے برداشت کرتا جا رہا تھا۔

پرمیشر سنگھ اسے اپنے گھر میں لے آیا۔ پہلے یہ کسی مسلمان کا گھر تھا۔ لٹا پٹا پرمیشر سنگھ جب ضلع لاہور سے ضلع امرت سر میں آیا تھا تو گاؤں والوں نے اسے یہ مکان الاٹ کر دیا تھا وہ اپنی بیوی اور بیٹی سمیت جب اس چار دیواری میں داخل ہوا تھا، ٹھٹھک کر رہ گیا تھا۔ اس کی اتنا ذرا سا تو ہے اور اسے بھی تو اسی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے جس نے ......"

"پوچھ لیتے ہیں اسی سے" ..... ایک اور سکھ بولا پھر اس نے سہمے ہوئے اختر کے پاس جا کر کہا..... "بولو تمھیں کس نے پیدا کیا ہے؟ خدا نے کہ واہگورو جی نے؟"

جناب احمد ندیم قاسمی ہمارے عہد کے سب سے بزرگ شاعراور ادیب تھے۔ 89 برس کی عمر میں 10 جون 2006 کی صبح 9 بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ قاسمی صاحب کی موت سے شعر و ادب کی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے وہ شاید ہی کبھی پر ہو سکے۔ ہم ان کی مغفرت کے لیے دست بہ دعا ہیں۔

اختر نے ساری خشکی کو نگلنے کی کوشش کی جو اس کی زبان کی نوک سے لے کر اس کی ناف تک پھیل چکی تھی، آنکھیں جھپک کر اس نے ان آنسوؤں کو گرا دینا چاہا جو ریت کی طرح اس کے پپوٹوں میں کھٹک رہے تھے۔ اس نے پرمیشر سنگھ کی طرف یوں دیکھا جیسے ماں کو دیکھ رہا ہے۔ منہ میں گئے ہوئے ایک آنسو کو تھوک ڈالا اور بولا۔ ''پتہ نہیں۔''

''لو اور سنو'' کسی نے کہا اور اختر کو گالی دے کر ہنسنے لگا۔

اختر نے ابھی اپنی بات پوری نہیں کی تھی، بولا ..... ''اماں تو کہتی ہے میں بھوسے کی کوٹھری میں پڑا ملا تھا۔''

سب سکھ ہنسنے لگے مگر پرمیشر سنگھ بچوں کی طرح بلبلا کر کچھ یوں رویا کہ دوسرے سکھ بھونچکا سے رہ گئے اور پرمیشر سنگھ رونی آواز میں جیسے بین کرنے لگا ... ''سب بچے ایک سے ہوتے ہیں یارو۔ میرا کرتارا بھی تو یہی کہتا تھا وہ بھی تو اس کی ماں کو بھوسے کی کوٹھری میں پڑا ملا تھا۔''

کرپان میان میں چلی گئی۔ سکھوں نے پرمیشر سنگھ سے الگ تھوڑی دیر کھسر پھسر کی۔ پھر ایک سکھ آگے بڑھا۔ بلکتے ہوئے اختر کو بازو سے پکڑے وہ چپ چاپ روتے ہوئے پرمیشر سنگھ کے پاس آیا اور بولا..... ''لے پرمیشرے'' سنبھال اسے، کیس بڑھوا کر اسے اپنا کرتارا بنالے ..... لے پکڑ''۔

پرمیشر نے اختر کو یوں جھپٹ کر اٹھالیا کہ اس کی پگڑی کھل گئی اور کیسوں کی لٹیں لٹکنے لگیں۔ اس نے اختر کو پاگلوں کی طرح چوما۔ اسے اپنے سینے سے بھینچا اور پھر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اور مسکرا مسکرا کر کچھ ایسی باتیں سوچنے لگا جنھوں نے اس کے چہرے کو چمکا دیا پھر اس نے پلٹ کر دوسرے سکھوں کی طرف دیکھا۔ اچانک وہ اختر کو نیچے اتار کر سکھوں کی طرف لپکا، مگر ان کے پاس سے گزر کر دور تک بھاگا چلا گیا۔ جھاڑیوں کے ایک جھنڈ میں بندروں کی طرح کودتا اور چھپتا رہا اور اس کے کیس اس کی لپک جھپٹ کا ساتھ دیتے رہے۔ دوسرے سکھ حیران کھڑے دیکھتے رہے، پھر وہ ایک ہاتھ کو دوسرے ہاتھ میں رکھے بھاگتا ہوا واپس آیا۔ اس کی بھیگی ہوئی داڑھی میں پھنسے ہوئے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور سرخ آنکھوں میں چمک تھی۔ آنکھیں پتھرا سی گئی تھیں اور وہ بڑی پر اسرار سرگوشی میں بولا تھا۔ ''یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔''

گرنتھی جی اور گاؤں کے دوسرے لوگ ہنس پڑے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی نے انھیں پہلے سے بتا دیا تھا کہ کرتار سنگھ کے بچھڑتے ہی انھیں کچھ ہو گیا ہے۔ ''جانے کیا ہو گیا ہے اسے'' اس نے کہا تھا۔ واہگورو جی جھوٹ نہ بلوائیں تو وہاں دن میں کوئی دس بار تو یہ کرتار سنگھ کو گدھوں کی طرح پیٹ ڈالتا تھا۔ اور جب سے کرتار سنگھ بچھڑا ہے تو میں تو خیر رو دھولی پر اس کا رونے سے بھی جی ہلکا نہیں ہوا۔ وہاں مجال ہے جو بیٹی امر کور کو میں ذرا بھی غصے سے دیکھ لیتی، بپھر جاتا تھا، کہتا تھا، بیٹی کو برا مت کہو۔ بیٹی بڑی مسکین ہوتی ہے۔ یہ تو ایک مسافر ہے بے چاری۔ ہمارے گھروندے میں ستانے بیٹھ گئی ہے۔ وقت آئے گا تو چلی جائے گی اور اب امر کور سے ذرا سا بھی کوئی قصور ہو جائے تو آپے ہی میں نہیں رہتا۔ یہاں تک بک دیتا ہے کہ بیٹیاں بیویاں اغوا ہوتے سنی تھیں یارو۔ یہ نہیں سنا تھا کہ پانچ برس کے بیٹے بھی اٹھ جاتے ہیں۔''

وہ ایک مہینے سے اس گھر میں مقیم تھا مگر ہر رات اس کا معمول تھا کہ پہلے سوتے میں بے تحاشا کروٹیں بدلتا پھر بڑبڑانے لگتا اور پھر اٹھ بیٹھتا۔ بڑی ڈری ہوئی سرگوشی میں بیوی سے کہتا۔ ''سنتی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔'' ..... بیوی اسے محض ''اونہہ'' سے ٹال کر سو جاتی تھی مگر امر کور کو اس سرگوشی کے بعد رات بھر نیند نہ آتی۔ اسے اندھیرے میں بہت سی پرچھائیاں ہر طرف بیٹھی قرآن پڑھتی نظر آتیں اور پھر جب ذرا سی پو پھٹتی تو وہ کانوں میں انگلیاں دے لیتی تھی۔ وہاں ضلع لاہور میں ان کا گھر مسجد کے پڑوس ہی میں تھا اور جب صبح اذان ہوتی تھی تو کیسا مزا آتا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے پورب سے پھوٹتا ہوا اجالا گانے لگا ہے۔ پھر جب اس کی پڑوسن پریتم کور کو چند نوجوانوں نے خراب کر کے چیتھڑے کی طرح گھورے پر پھینک دیا تھا تو جانے کیا ہوا کہ مؤذن کی اذان میں بھی اسے پریتم کور کی چیخ سنائی دے رہی تھی، اذان کا تصور تک اسے خوف زدہ کر دیتا تھا اور وہ یہ بھی بھول جاتی تھی کہ اب ان کے پڑوس میں مسجد نہیں ہے۔ یوں ہی کانوں میں انگلیاں دیتے ہوئے وہ سو جاتی اور رات بھر جاگتے رہنے کی وجہ سے دن چڑھے تک سوئی رہتی تھی اور پرمیشر سنگھ اس بات پر بگڑ جاتا..... ''ٹھیک ہے سوئے نہیں تو اور کیا کرے۔ لڑکی تو ہوتی ہیں یہ چھوکریاں۔ لڑکا ہوتا اب تک جانے کتنے کام کر چکا ہوتا یارو۔''

پرمیشر سنگھ آنگن میں داخل ہوا تو آج خلاف معمول اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ اس کے کھلے کیس کنگھے سمیت اس کی پیٹھ اور ایک کندھے پر بکھرے ہوئے تھے اور اس کا ایک ہاتھ اختر کی کمر تھپکے جا رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک طرف بیٹھی چھاج میں گندم پھٹک رہی تھی۔ اس کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رک گئے اور وہ ٹکر ٹکر پرمیشر سنگھ کو دیکھنے لگی۔ پھر وہ چھاج پرے کو دھکیلتی ہوئی آئی اور بولی۔

''یہ کون ہے؟''

پرمیشر سنگھ بدستور مسکراتے ہوئے بولا ..... ''ڈرو نہیں بیوقوف اس کی عادتیں بالکل کرتارے کی سی ہیں یہ بھی اپنی ماں کو بھوسے کی کوٹھری میں پڑا ملا تھا۔ یہ بھی تتلیوں کا عاشق ہے اس کا نام اختر ہے۔''

''اختر'' بیوی کے تیور بدل گئے۔

''تم اسے اختر سنگھ کہہ لینا'' پرمیشر سنگھ نے وضاحت کی..... ''اور پھر کیسوں کا کیا ہے، دنوں میں بڑھ جاتے ہیں۔ کڑا اور کچھیرا پہنا دو، کنگھا کیسوں کے بڑھتی لگ جائے گا۔''

''پر یہ ہے کس کا؟'' بیوی نے مزید وضاحت چاہی۔

''کس کا ہے!'' پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر سے اتار کر اسے زمین پر کھڑا کر دیا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ واہگورو جی کا ہے ہمارا اپنا ہے اور پھر یارو یہ عورت اتنا بھی دیکھ نہیں سکتی کہ اختر کے ماتھے پر جو یہ ذرا سا تل ہے یہ کرتارے ہی کا تل ہے۔ کرتارے کے بھی تو ایک تل تھا اور یہیں تھا۔ ذرا بڑا تھا پر ہم اسے یہیں تل پر تو چومتے تھے۔ اور یہ اختر کے کانوں کی لویں گلاب کے پھول کی طرح گلابی ہیں تو یارو۔ یہ عورت یہ تک نہیں سوچتی کہ کرتارے کے کانوں کی لویں بھی تو ایسی ہی تھیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ذرا موٹی تھیں یہ ذرا پتلی ہیں اور......''

اختر اب تک مارے حیرت کے ضبط کیے بیٹھا تھا۔ بلبلا اٹھا...... ''ہم نہیں رہیں گے، ہم اماں پاس جائیں گے، اماں پاس۔''

پرمیشر سنگھ نے اختر کا ہاتھ پکڑ کر اسے بیوی کی طرف بڑھایا...... ''اری لو۔ یہ اماں کے پاس جانا چاہتا ہے۔''

''تو جائے۔'' بیوی کی آنکھوں میں اور چہرے پر وہی آسیب آ گیا تھا جسے پرمیشر سنگھ اپنی آنکھوں اور چہرے میں سے نوچ کر باہر کھیتوں میں جھٹک آیا تھا...... ''ڈاکہ مارنے گیا تھا سورما۔ اور اٹھا لایا یہ ہاتھ بھر کا لونڈا۔ ارے کوئی لڑکی ہی اٹھا لاتا۔ تو ہزار میں نہ سہی، ایک دو سو میں بک جاتی۔ اس اجڑے گھر کا کھاٹ کھٹولہ بن جاتا اور پھر...... پگلے تجھے تو کچھ ہو گیا ہے، دیکھتے نہیں یہ لڑکا مُسلا ہے؟ جہاں سے اٹھا لائے ہو وہیں واپس ڈال آؤ۔ خبردار جو اس نے میرے چوکے میں پاؤں رکھا۔''

پرمیشر سنگھ نے التجا کی...... ''کرتارے اور اختر کو ایک ہی واہگورو جی نے پیدا کیا ہے، سمجھیں۔''

''نہیں'' اب کے بیوی چیخ اٹھی...... ''میں نہیں سمجھی اور نہ کچھ سمجھنا چاہتی ہوں، میں رات ہی رات میں جھٹکا کر ڈالوں گی اس کا، کاٹ کے پھینک دوں گی۔ اٹھا لایا ہے وہاں سے، لے جا اسے پھینک دے باہر۔''

''تمھیں نہ پھینک دوں باہر؟''...... اب کے پرمیشر سنگھ بگڑ گیا۔

''تمھارا نہ کر ڈالوں جھٹکا؟ وہ بیوی کی طرف بڑھا اور بیوی اپنے سینے کو دو ہتڑوں سے پیٹتی، چیختی، چلاتی بھاگی۔ پڑوس سے امر کور دوڑی آئی۔ اس کے پیچھے گلی کی دوسری عورتیں بھی آ گئیں۔ مرد بھی جمع ہو گئے اور پرمیشر سنگھ کی بیوی پٹنے سے بچ گئی۔ پھر سب نے اسے سمجھایا کہ نیک کام ہے، ایک مسلمان کا سکھ بنانا کوئی معمولی کام تو نہیں۔ پرانا زمانہ ہوتا تو اب تک پرمیشر سنگھ گرو مشہور ہو چکا ہوتا۔ بیوی کی ڈھارس بندھی مگر امر کور ایک کونے میں بیٹھی گھٹنوں میں سر دیے روتی رہی۔ اچانک پرمیشر سنگھ کی گرج نے سارے ہجوم کو ہلا دیا...... ''اختر کدھر گیا ہے۔'' وہ چڑھ گیا یارو......؟ اختر...... اختر......!'' وہ چیختا ہوا مکان کے کونوں کھدروں میں جھانکتا ہوا باہر بھاگ گیا۔ بچے مارے دلچسپی کے اس کے تعاقب میں تھے۔ عورتیں چھتوں پر چڑھ گئی تھیں اور پرمیشر سنگھ گلیوں میں سے باہر کھیتوں میں نکل گیا تھا...... ''ارے میں تو اسے اماں پاس لے چلتا یارو۔ ارے وہ گیا کہاں؟ اختر......! اے اختر......!''

''میں تمھارے پاس نہیں آؤں گا۔'' پگڈنڈی کے ایک موڑ پر گیان سنگھ کے گنے کے کھیت کی آڑ میں روتے ہوئے اختر نے پرمیشر سنگھ کو ڈانٹ دیا۔ ''تم تو سکھ ہو۔''

''ہاں بھیا میں تو سکھ ہوں۔'' پرمیشر سنگھ نے جیسے مجبور ہو کر اعتراف جرم کر لیا۔

''تو پھر ہم نہیں آئیں گے۔'' اختر نے پرانے آنسوؤں کو پونچھ کر نئے آنسوؤں کے لیے راستہ صاف کیا۔

''نہیں آؤ گے؟'' پرمیشر سنگھ کا لہجہ اچانک بدل گیا۔

''نہیں۔''

''نہیں آؤ گے؟''

''نہیں۔ نہیں نہیں۔''

''کیسے نہیں آؤ گے؟'' پرمیشر سنگھ نے اختر کو کان سے پکڑا اور پھر نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبا کر اس کے منہ میں چٹاخ سے ایک تھپڑ مار دیا۔ ''چلو'' وہ کڑکا۔

اختر یوں سہم گیا جیسے ایک دم اس کا سارا خون نچڑ کر رہ گیا ہے۔ پھر ایکا ایکی وہ زمین پر گر کر پاؤں پٹخنے، خاک اڑانے اور بلک بلک کر رونے لگا۔ ''نہیں چلتا، بس نہیں چلتا تم سکھ ہو، میں سکھوں کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں اپنی اماں پاس جاؤں گا، میں تمھیں مار دوں گا۔''

اور اب جیسے پرمیشر سنگھ کے سہمنے کی باری تھی۔ اس کا بھی سارا خون جیسے نچڑ کر رہ گیا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ کو دانتوں میں جکڑ لیا۔ اس کے نتھنے پھڑ کنے لگے اور پھر اس زور سے رویا کہ کھیت کی پرلی مینڈ پر آتے ہوئے چند پڑوسی اور ان کے بچے بھی سہم کر رہ گئے اور ٹھٹک گئے۔ پرمیشر سنگھ گھٹنوں کے بل اختر کے سامنے بیٹھ گیا۔ بچوں کی طرح یوں سسک سسک کر رونے لگا کہ اس کا نچلا ہونٹ بھی بچوں کی طرح لٹک آیا اور پھر بچوں کی سی روتی آواز میں بولا۔

''مجھے معاف کر دے اختر، مجھے تمھارے خدا کی قسم میں تمھارا دوست ہوں، تم اکیلے یہاں سے جاؤ گے تو تمھیں کوئی مار دے گا۔ پھر تمھاری ماں پاکستان سے آ کر مجھے مارے گی۔ میں خود جا کر تمھیں پاکستان چھوڑ آؤں گا۔ سنا؟ پھر وہاں اگر تمھیں ایک لڑکا مل جائے نا۔ کرتارا نام کا تو تم اسے ادھر گاؤں میں چھوڑ جانا۔ اچھا؟''

''اچھا!'' اختر نے الٹے ہاتھوں سے آنسو پونچھتے ہوئے پرمیشر سنگھ سے سودا کر لیا۔

پرمیشر سنگھ نے اختر کو کندھے پر بٹھا لیا اور چلا مگر ایک ہی قدم اٹھا کر رک گیا۔ سامنے بہت سے بچے اور پڑوسی کھڑے اس کی تمام حرکات دیکھ رہے

تھے۔ ادھیڑ عمر کا ایک پڑوسی بولا...... ''روتے کیوں ہو پرمیشرے، کل ایک مہینے کی تو بات ہے، ایک مہینے میں اس کے کیس بڑھ آئیں گے تو بالکل کرتارا لگنے گا۔''

کچھ کہے بغیر وہ تیز تیز قدم اٹھانے لگا۔ پھر ایک جگہ رک کر اس نے پلٹ کر اپنے پیچھے آنے والے پڑوسیوں کی طرف دیکھا...... ''تم کتنے ظالم لوگ ہو یارو۔ اختر کو کرتارا بناتے ہو اور ادھر اگر کوئی کرتارے کو اختر بنا لے تو؟ اسے ظالم ہی کہو گے نا۔'' پھر اس کی آواز میں گرج آ گئی...... ''یہ لڑکا مسلمان ہی رہے گا۔ دربار صاحب کی سوں۔ میں کل ہی امرت سر جا کر اس کے انگریزی بال بنوا لاؤں گا۔ تم نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے، خالصہ ہوں، سینے میں شیر کا دل ہے، مرغی کا نہیں۔''

پرمیشر سنگھ اپنے گھر میں داخل ہو کر ابھی اپنی بیوی اور بیٹی ہی کو اختر کی مدارات کے سلسلے میں احکام ہی دے رہا تھا کہ گاؤں کا گرنتھی سردار سنتو سنگھ اندر آیا اور بولا۔

''پرمیشر سنگھا۔''

''جی'' پرمیشر سنگھ نے پلٹ کر دیکھا۔ گرنتھی جی کے پیچھے اس کے سب پڑوسی بھی تھے۔

''دیکھو'' گرنتھی جی نے بڑے دبدبے سے کہا...... ''کل سے یہ لڑکا خالصے کی سی پگڑی باندھے گا، کڑا پہنے گا، دھرم شالہ آئے گا اور اسے پرشاد کھلایا جائے گا۔ اس کے کیسوں کو قینچی نہیں چھوئے گی۔ چھوگئی تو کل ہی سے یہ گھر خالی کر دو سمجھے؟''

''جی'' پرمیشر سنگھ نے آہستہ سے کہا۔

''ہاں۔'' گرنتھی جی نے آخری ضرب لگائی۔

''ایسا ہی ہوگا گرنتھی جی۔'' پرمیشر سنگھ کی بیوی بولی...... ''پہلے ہی اسے راتوں کو گھر کے کونے کونے سے کوئی چیز قرآن پڑھتی سنائی دیتی ہے۔ لگتا ہے پہلے جنم میں مُسلا رہ چکا ہے۔ امرکور بیٹی نے تو جب سے یہ سنا ہے کہ ہمارے گھر میں مُسلا چھوکرا آیا ہے تو بیٹھی رو رہی ہے، کہتی ہے گھر پر کوئی اور آفت آئے گی۔ پرمیشرے نے آپ کا کہا نہ مانا تو میں بھی دھرم شالہ میں چلی آؤں گی اور امرکور بھی۔ پھر یہ اس چھوکرے کو چاٹے مُوا نکما، واہگورو جی کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔''

''واہگورو جی کا لحاظ کون نہیں کرتا گدھی'' پرمیشر سنگھ نے گرنتھی جی کی بات کا غصہ بیوی پر نکالا۔ پھر وہ زیر لب گالیاں دیتا رہا۔ کچھ دیر کے بعد وہ اٹھ کر گرنتھی جی کے پاس آ گیا۔ ''اچھا جی اچھا'' اس نے کہا۔ گرنتھی جی پڑوسیوں کے ساتھ فوراً رخصت ہو گئے۔

چند ہی دنوں میں اختر کو دوسرے سکھ لڑکوں سے پہچاننا دشوار ہو گیا۔ وہی کانوں کی لوؤں تک کس کر بندھی ہوئی پگڑی، وہی ہاتھ کا کڑا اور وہی کچھیرا۔ صرف جب وہ گھر میں آ کر پگڑی اتارتا تھا تو اس کے غیر سکھ ہونے کا راز کھلتا تھا۔ لیکن اس کے بال دھڑا دھڑ بڑھ رہے تھے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی ان بالوں کو چھو کر بہت خوش ہوتی...... ''ذرا ادھر تو آ امرکورے، یہ دیکھ کیس بن رہے ہیں۔ پھر ایک دن جوڑا بنے گا۔ کنگھا لگے گا اور اس کا نام رکھا جائے گا کرتار سنگھ۔''

''نہیں ماں۔'' امرکور وہیں سے جواب دیتی...... ''جیسے واہگورو جی ایک ہیں، اور گرنتھ صاحب ایک ہیں اور چاند ایک ہے۔ اسی طرح کرتارا بھی ایک ہے۔ میرا ننھا منا بھائی!'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اور مچل کر کہتی...... ''میں اس کھلونے سے نہیں بہلوں گی ماں، میں جانتی ہوں ماں یہ مسلا ہے اور جو کرتارا ہوتا ہے وہ مسلا نہیں ہوتا۔''

''میں کب کہتی ہوں یہ سچ مچ کا کرتارا ہے۔ میرا چاند سا لاڈلا بچہ!''...... پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی رو دیتی۔ دونوں اختر کو اکیلا چھوڑ کر کسی گوشے میں بیٹھ جاتیں۔ خوب خوب روتیں، ایک دوسرے کو تسلیاں دیتیں اور پھر زار زار رونے لگتیں وہ اپنے کرتارے کے لیے روتیں، اختر چند روز اپنی ماں کے لیے رویا، اب کسی اور بات پر روتا، جب پرمیشر سنگھ شرنارتھیوں کی امدادی پنچایت سے کچھ غلہ یا کپڑا لے کر آتا تو اختر بھاگ کر جاتا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتا اور رو رو کر کہتا...... ''میرے سر پر پگڑی باندھ دو پرموں...... میرے کیس بڑھا دو۔ مجھے کنگھا خرید دو۔''

پرمیشر سنگھ اسے سینے سے لگا لیتا اور بھرائی ہوئی آواز میں کہتا...... ''یہ سب ہو جائے گا بچے۔ سب کچھ ہو جائے گا پر ایک بات کبھی نہ ہوگی۔ وہ بات کبھی نہ ہوگی۔ وہ نہیں ہوگا مجھ سے سمجھے؟ یہ کیس ویس سب بڑھ آئیں گے۔''

اختر اپنی ماں کو بہت کم یاد کرتا تھا۔ جب تک پرمیشر سنگھ گھر میں رہتا وہ اس سے چمٹا رہتا اور جب وہ کہیں باہر جاتا تو اختر اس کی بیوی اور امرکور کی طرف یوں دیکھتا رہتا جیسے ان سے ایک ایک پیار کی بھیک مانگ رہا ہے۔ پرمیشر سنگھ کی بیوی اسے نہلاتی، اس کے کپڑے دھوتی، اور پھر اس کے بالوں میں کنگھی کرتے ہوئے رونے لگتی اور روتی رہ جاتی۔ البتہ امرکور نے جب بھی دیکھا، ناک اچھال دی۔ شروع شروع میں تو اس نے اختر کو دھموکا بھی جڑ دیا تھا مگر جب اختر نے پرمیشر سنگھ سے اس کی شکایت کی تو پرمیشر سنگھ بپھر گیا اور امرکور کو بڑی ننگی ننگی گالیاں دیتا اس کی طرف بڑھا کہ اگر اس کی بیوی راستے میں اس کے پاؤں نہ پڑ جاتی تو وہ بیٹی کو اٹھا کر دیوار پر سے گلی میں پٹخ دیتا...... ''الو کی پٹھی۔'' اس روز اس نے کڑک کر کہا تھا۔

''سنا تو یہی تھا کہ لڑکیاں اٹھ رہی ہیں پر یہاں یہ مشٹنڈی ہمارے ساتھ لگی چلی آئی اور اٹھ گیا تو پانچ سال کا لڑکا جسے ابھی اچھی طرح ناک پونچھنا نہیں آتا۔ عجیب اندھیر ہے یارو۔'' اس واقعے کے بعد امرکور نے اختر پر ہاتھ تو خیر کبھی نہ اٹھایا مگر اس کی نفرت دو چند ہو گئی۔

ایک روز اختر کو تیز بخار آ گیا۔ پرمیشر سنگھ وید کے پاس چلا گیا اور اس کے

جانے کے کچھ دیر بعد اس کی بیوی پڑوسن سے پسی ہوئی سونف مانگنے چلی گئی۔ اختر کو پیاس لگی۔

''پانی'' اس نے کہا، کچھ دیر بعد لال لال سوجی سوجی آنکھیں کھولیں۔ ادھر ادھر دیکھا اور پانی کا لفظ ایک کراہ بن کر اس کے حلق سے نکلا۔ کچھ دیر کے بعد وہ لحاف کو ایک طرف جھٹک کر اٹھ بیٹھا۔ امرکور سامنے دہلیز پر بیٹھی کھجور کے پتوں سے چنگیر بنا رہی تھی ..... ''پانی دے!'' اختر نے اسے ڈانٹا۔ امرکور نے بھنویں سکیڑ کر اسے گھور کر دیکھا اور اپنے کام میں جٹ گئی۔ اب کے اختر چلایا..... ''پانی دیتی ہے کہ نہیں ..... پانی دے ورنہ ماروں گا''..... امرکور نے اب کے اس کی طرف دیکھا ہی نہیں۔ بولی..... ''مار تو سہی۔ تو کرتار انہیں کہ میں تیری مار سہہ لوں گی۔ میں تو تیری بوٹی بوٹی کر ڈالوں گی۔'' اختر بلک بلک کر رو دیا۔ اور آج اس نے مدّت کے بعد اپنی اماں کو یاد کیا۔ پھر جب پرمیشر سنگھ دوا لے آیا اور اس کی بیوی بھی پسی ہوئی سونف لے کر آ گئی تو اختر نے روتے روتے بری حالت بنالی تھی اور وہ سسک سسک کر کہہ رہا تھا۔ ''ہم تو اب اماں پاس چلیں گے۔ یہ امرکور سور کی بچی تو پانی بھی نہیں پلاتی۔ ہم تو اماں پاس جائیں گے۔'' پرمیشر سنگھ نے امرکور کی طرف غصے سے دیکھا۔ وہ رو رہی تھی اور اپنی ماں سے کہہ رہی تھی ..... ''کیوں پانی پلاؤں؟ کرتار ابھی تو کہیں اسی طرح پانی مانگ رہا ہوگا کسی سے۔ کسی کو اس پر ترس نہ آئے تو ہمیں کیوں ترس آئے اس پر..... ہاں''۔

پرمیشر سنگھ اختر کی طرف بڑھا اور اپنی بیوی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''یہ بھی تو تمھاری ماں ہے بیٹے۔''

''نہیں'' اختر بڑے غصے سے بولا۔ ''یہ تو سکھ ہے۔ میری اماں تو پانچ وقت نماز پڑھتی ہے اور بسم اللہ کہہ کر پانی پلاتی ہے۔''

پرمیشر سنگھ کی بیوی جلدی سے ایک پیالہ بھر کر لائی تو اختر نے پیالے کو دیوار پر دے مارا اور چلایا۔ ''تمھارے ہاتھ سے نہیں پئیں گے۔''

''یہ بھی تو مجھی سور کی بچی کا باپ ہے۔'' امرکور نے جل کر کہا۔

''تو ہوا کرے'' اختر بولا..... ''تمھیں اس سے کیا۔''

پرمیشر سنگھ کے چہرے پر عجیب کیفیتیں دھوپ چھاؤں سی پیدا کر گئیں۔ وہ اختر کے مطالبے پر مسکرایا بھی اور رو بھی دیا۔ پھر اس نے اختر کو پانی پلایا۔ اس کے ماتھے کو چوما۔ اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا، اسے بستر پر لٹا کر اس کے سر کو ہولے ہولے کھجاتا رہا اور کہیں شام کو جا کر اس نے پہلو بدلا۔ اس وقت اختر کا بخار اتر چکا تھا اور وہ بڑے مزے سے سو رہا تھا۔

آج بہت عرصے کے بعد رات کو پرمیشر سنگھ بھڑک اٹھا اور نہایت آہستہ سے بولا۔

''اری سنتی ہو؟..... سن رہی ہو؟ یہاں کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔''

بیوی نے پہلے تو اسے پرمیشر سنگھ کی پرانی عادت کہہ کر ٹالنا چاہا مگر پھر ایک دم ہڑبڑا کر اٹھی اور امرکور کی کھاٹ کی طرف ہاتھ بڑھا کر اسے ہولے ہولے ہلا کر آہستہ سے بولی..... ''بیٹی!''

''کیا ہے ماں؟'' امرکور چونک اٹھی۔

اور اس نے سرگوشی کی۔ ''سنو تو۔ سچ مچ کوئی چیز قرآن پڑھ رہی ہے۔''

یہ ایک ثانیے کا سناٹا بڑا خوف ناک تھا۔ امرکور کی چیخ اس سے بھی زیادہ خوف ناک تھی اور پھر اختر کی چیخ خوف ناک تر تھی۔

''کیا ہوا بیٹا'' پرمیشر سنگھ تڑپ کر اٹھا اور اختر کی کھاٹ پر جا کر اسے چھاتی سے بھینچ لیا۔ ''ڈر گئے بیٹا۔''

''ہاں'' اختر لحاف میں سے سر نکال کر بولا۔ ''کوئی چیز چیخی تھی۔''

''امرکور چیخی تھی'' پرمیشر سنگھ نے کہا..... ''ہم سب یوں سمجھے جیسے کوئی چیز یہاں قرآن پڑھ رہی ہے۔''

''میں پڑھ رہا تھا'' اختر بولا۔

اب کے بھی امرکور کے منہ سے ہلکی چیخ نکل گئی۔

بیوی نے جلدی سے چراغ جلا دیا اور امرکور کی کھاٹ پر بیٹھ کر وہ دونوں اختر کو یوں دیکھنے لگیں جیسے وہ ابھی دھواں بن کر دروازے کی جھریوں میں سے باہر اڑ جائے گا اور باہر سے ایک ڈراؤنی آواز آئے گی۔ ''میں جن ہوں میں کل رات پھر آکر قرآن پڑھوں گا۔''

''کیا پڑھ رہے تھے بھلا؟'' پرمیشر سنگھ نے پوچھا۔

''پڑھوں؟'' اختر نے پوچھا۔

''ہاں ہاں'' پرمیشر سنگھ نے بڑے شوق سے کہا۔

اور اختر قُل ھو اللہ احد پڑھنے لگا۔ کُفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے گریبان میں چھوکی اور پھر پرمیشر سنگھ کی طرف مسکراتے ہوئے بولا..... ''تمھارے سینے میں بھی چھوکر دوں؟''

''ہاں ہاں'' پرمیشر سنگھ نے گریبان کا بٹن کھول دیا اور اختر نے چھوکر دی۔ اب کے امرکور نے بڑی مشکل سے چیخ پر قابو پایا۔

پرمیشر سنگھ بولا..... ''کیا نیند نہیں آتی تھی؟''

''ہاں'' اختر بولا..... ''اماں یاد آ گئی۔ اماں کہتی ہے، نیند نہ آئے تو تین بار قُل ھو اللہ پڑھو نیند آ جائے گی، اب آ رہی تھی، پر امرکور نے ڈرا دیا۔''

''پھر سے پڑھ کر سو جاؤ'' پرمیشر سنگھ نے کہا..... ''روز پڑھا کرو۔ اونچے اونچے پڑھا کرو اسے بھولنا نہیں ورنہ تمھاری اماں تمھیں مارے گی۔ لو اب سو جاؤ۔'' اس نے اختر کو لٹا کر اسے لحاف اوڑھا دیا۔ پھر چراغ بجھانے کے لیے بڑھا تو امرکور پکاری..... ''نہیں نہیں بابا۔ بجھاؤ نہیں۔ ڈر لگتا ہے۔''

''جلتا رہے، کیا ہے؟'' بیوی بولی۔

اور پرمیشر سنگھ دیا بجھا کر ہنس دیا..... ''پگلیاں'' وہ بولا..... ''گدھیاں۔''

رات کے اندھیرے میں اختر آہستہ آہستہ قل ھو اللہ پڑھتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد ذرا ذرا سے خراٹے لینے لگا۔ پرمیشر سنگھ بھی سو گیا اور اس کی بیوی بھی۔ مگر امر کور رات بھر کچی نیند میں "پڑوس" کی مسجد کی اذان سنتی رہی اور ڈرتی رہی۔

اب اختر کے اچھے خاصے کیس بڑھ آئے تھے۔ ننھے سے جوڑے میں کنگھا بھی اٹک جاتا تھا۔ گاؤں والوں کی طرح پرمیشر سنگھ کی بیوی بھی اسے کرتارا کہنے لگی تھی اور اس سے خاصی شفقت سے پیش آتی تھی مگر امر کور اختر کو یوں دیکھتی تھی جیسے وہ کوئی بہروپیا ہے اور ابھی وہ پگڑی اور کیس اتار کر پھینک دے گا اور قل ھو اللہ پڑھتا ہوا غائب ہو جائے گا۔

ایک دن پرمیشر سنگھ بڑی تیزی سے گھر آیا اور ہانپتے ہوئے اپنی بیوی سے پوچھا۔

"وہ کہاں ہے؟"

"کون؟ امر کور؟"

"نہیں۔"

"کرتارا؟"

"نہیں..." پھر کچھ سوچ کر بولا... "ہاں ہاں وہی کرتارا۔"

"باہر کھیلنے گیا ہے۔ گلی میں ہوگا۔"

پرمیشر سنگھ واپس لپکا۔ گلی میں جا کر بھاگنے لگا۔ باہر کھیتوں میں جا کر اس کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ پھر اسے دور گیان سنگھ کے گنوں کی فصل کے پاس چند بچے کبڈی کھیلتے نظر آئے۔ کھیت کی اوٹ سے اس نے دیکھا کہ اختر نے ایک لڑکے کو گھٹنوں تلے دبا رکھا ہے۔ لڑکے کے ہونٹوں سے خون پھوٹ رہا ہے مگر کبڈی کبڈی کی رٹ جاری ہے۔ پھر اس لڑکے نے جیسے ہار مان لی۔ اور جب اختر کی گرفت سے چھوٹا تو بولا..... "کیوں بے کرتارا! تو نے میرے منہ پر گھٹنا کیوں مارا ہے؟"

"اچھا کیا جو مارا" اختر اکڑ کر بولا اور بکھرے ہوئے جوڑے کی لٹیں سنبھال کر ان میں کنگھا پھنسانے لگا۔

"تمھارے رسول نے تمھیں یہی سمجھایا ہے؟" لڑکے نے طنز سے پوچھا۔

اختر ایک لمحے کے لیے چکرا گیا۔ پھر سوچ کر بولا..... "اور کیا تمھارے گرو نے تمھیں یہی سمجھایا ہے؟"

"مسلا" لڑکے نے اسے گالی دی۔

"سکھو!" اختر نے اسے گالی دی۔

سب لڑکے اختر پر ٹوٹ پڑے مگر پرمیشر سنگھ کی ایک ہی کڑک سے میدان صاف تھا۔ اس نے اختر کی پگڑی باندھی اور اسے ایک طرف لے جا کر بولا.....

"سنو بیٹے! میرے پاس رہو گے کہ اماں کے پاس جاؤ گے.....؟"

اختر کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔ کچھ دیر تک پرمیشر سنگھ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے کھڑا رہا پھر مسکرانے لگا اور بولا..... "اماں پاس جاؤں گا۔"

"اور میرے پاس نہیں رہو گے؟"

پرمیشر سنگھ کا رنگ یوں سرخ ہو گیا جیسے وہ رو دے گا۔

"تمھارے پاس بھی رہوں گا؟" اختر نے معمے کا حل پیش کر دیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے اٹھا کر سینے سے لگا لیا اور وہ آنسو جو مایوسی نے آنکھوں میں جمع کیے تھے، خوشی کے آنسو بن کر ٹپک پڑے۔ وہ بولا..... "دیکھو بیٹے! اختر بیٹے آج یہاں فوج آ رہی ہے یہ فوجی تمھیں مجھ سے چھیننے آ رہے ہیں، سمجھے؟ تم کہیں چھپ جاؤ۔ پھر جب وہ چلے جائیں گے نا، تو میں تمھیں لے آؤں گا۔"

پرمیشر سنگھ کو اس وقت دور غبار کا ایک پھیلتا ہوا بگولہ دکھائی دیا۔ مینڈ پر چڑھ کر اس نے لمبے ہوتے ہوئے بگولے کو غور سے دیکھا اور اچانک تڑپ کر بولا..... "فوجیوں کی لاری آ گئی..." وہ مینڈ پر سے کود پڑا اور گنے کے کھیت کا پورا چکر کاٹ گیا۔

"گیانے، او گیان سنگھ!" وہ چلایا۔ گیان سنگھ فصل کے اندر سے نکل آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے ہاتھ میں تھوڑی سی گھاس تھی.....

پرمیشر سنگھ اسے الگ لے گیا، اسے کوئی بات سمجھائی پھر دونوں اختر کے پاس آئے۔ گیان سنگھ نے فصل میں سے ایک گنا توڑ کر درانتی سے اس کے پتے کاٹے اور اسے اختر کے حوالے کر کے بولا..... "آؤ بھائی کرتارے تم میرے پاس بیٹھ کر گنا چوسو جب تک یہ فوجی چلے جائیں۔ اچھا خاصا بنا بنایا خالصہ جتھیانے آئے ہیں۔ ہونہہ!"..... پرمیشر سنگھ نے اختر سے جانے کی اجازت مانگی..... "جاؤں.....؟"

اور اختر نے دانتوں میں گنے کا لمبا سا چھلکا جکڑے ہوئے مسکرانے کی کوشش کی۔ اجازت پا کر پرمیشر سنگھ گاؤں کی طرف بھاگ گیا۔ بگولا گاؤں کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔

گھر جا کر اس نے بیوی اور بیٹی کو سمجھایا۔ پھر بھاگم بھاگ گرنتھی جی کے پاس گیا۔ ان سے بات کر کے ادھر ادھر دوسرے لوگوں کو سمجھاتا پھیرا۔ اور جب فوجیوں کی لاری دھرم شالہ سے ادھر کھیت میں رک گئی تو سب فوجی اور پولیس والے گرنتھی جی کے پاس آئے۔ ان کے ساتھ علاقے کا نمبردار بھی تھا۔ مسلمان لڑکیوں کے بارے میں پوچھ گچھ ہوتی رہی۔ گرنتھی جی نے گرنتھ صاحب کی قسم کھا کر کہہ دیا کہ اس گاؤں میں کوئی مسلمان لڑکی نہیں "لڑکے کی بات دوسری ہے۔" کسی نے پرمیشر سنگھ کے کان میں سرگوشی کی اور آس پاس کے سکھ پرمیشر سنگھ سمیت زیر لب مسکرانے لگے۔ پھر ایک فوجی افسر نے گاؤں والوں کے سامنے ایک تقریر کی۔ اس نے مامتا پر بڑا زور دیا جو ان ماؤں کے دلوں میں ان دنوں ٹیس بن کر رہ گئی تھی جن کی بیٹیاں چھن گئی تھیں اور ان بھائیوں اور شوہروں کی پیار کی بڑی دردناک تصویر کھینچی جن کی بہنیں اور بیویاں

ان سے ہتھیا لی گئی تھیں...... ''اور مذہب کیا ہے دوستو۔'' اس نے کہا تھا......
''دنیا کا ہر مذہب انسان کو انسان بننا سکھاتا ہے اور تم مذہب کے نام لے کر انسان کو انسان سے لڑا دیتے ہو۔ ان کی آبرو پر ناچتے ہو اور کہتے ہو ہم سکھ ہیں، ہم مسلمان ہیں...... ہم واہگورو جی کے چیلے ہیں، ہم رسول کے غلام ہیں۔''

تقریر کے بعد مجمع چھٹنے لگا۔ فوجیوں کے افسر نے گرنتھی جی کا شکریہ ادا کیا۔ ان سے ہاتھ ملایا اور لاری چلی گئی۔

سب سے پہلے گرنتھی جی نے پرمیشر سنگھ کو مبارک باد دی۔ پھر دوسرے لوگوں نے پرمیشر سنگھ کو گھیر لیا اور اسے مبارک باد دینے لگے لیکن پرمیشر سنگھ لاری آنے سے پہلے حواس باختہ ہو رہا تھا تو اب لاری جانے کے بعد لٹا لٹا سا لگ رہا تھا۔ پھر وہ گاؤں سے نکل کر گربان سنگھ کے کھیت میں آیا۔ اختر کو کندھے پر بٹھا کر گھر میں لے آیا۔ کھانا کھلانے کے بعد اسے کھاٹ پر لٹا کر کچھ یوں تھپکا کہ اسے نیند آگئی۔ پرمیشر سنگھ دیر تک کھاٹ پر بیٹھا رہا۔ کبھی داڑھی کھجاتا اور ادھر ادھر دیکھ کر پھر سوچ میں بیٹھ جاتا۔ پڑوس کی چھت پر کھیلتا ہوا ایک بچہ اچانک اپنی ایڑی پکڑ کر بیٹھ گیا اور زار زار رونے لگا۔ ''ہائے اتنا بڑا کانٹا اتر گیا پورے کا پورا'' وہ چلایا اور پھر اس کی ماں ننگے سر اوپر بھاگی۔ اسے گود میں بٹھا لیا پھر نیچے بیٹی کو پکار کر سوئی منگوائی۔ کانٹا نکالنے کے بعد اسے بے تحاشا چوما اور پھر نیچے جھک کر پکاری...... ''ارے میرا دوپٹہ تو اوپر پھینک دینا۔ کیسی بے حیائی سے اوپر بھاگی چلی آئی۔''

پرمیشر سنگھ نے کچھ دیر بعد چونک کر بیوی سے پوچھا۔
''سنو کیا تمھیں کرتارا اب بھی یاد آتا ہے۔''
''لو اور سنو'' بیوی بولی اور پھر ایک دم چھاجوں رو دی...... ''کرتارا تو میرے کلیجے کا ناسور بن گیا ہے پرمیشرے!''

کرتارے کا نام سن کر ادھر سے امر کور اٹھ کر آئی اور روتی ہوئی ماں کے گھٹنے کے پاس بیٹھ کر رونے لگی۔

پرمیشر سنگھ یوں بدک کر جلدی سے اٹھ بیٹھا جیسے اس نے شیشے کے برتنوں سے بھرا ہوا طشت اچانک زمین پر دے مارا ہو۔

شام کے کھانے کے بعد وہ اختر کو انگلی سے پکڑے باہر والان میں آیا اور بولا۔ ''آج تو دن بھر خوب سوئے ہو بیٹا۔ چلو آج ذرا گھومنے چلتے ہیں۔ چاندنی رات ہے۔''

اختر فوراً مان گیا۔ پرمیشر سنگھ نے اسے کمبل میں لپیٹا اور کندھے پر بٹھا لیا۔ کھیتوں میں آکر وہ بولا۔ ''یہ چاند جو پورب سے نکل رہا ہے نا بیٹے، جب یہ ہمارے سر پر پہنچے گا تو صبح ہو جائے گی۔''

اختر چاند کی طرف دیکھنے لگا۔
''یہ چاند جو یہاں چمک رہا ہے نا۔ یہ وہاں بھی چمک رہا ہوگا۔ تمھاری اماں کے دیس میں۔''

اب کے اختر نے جھک کر پرمیشر سنگھ کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔
''یہ چاند ہمارے سر پر آئے گا تو وہاں تمھاری اماں کے سر پر بھی ہوگا۔''
اب کے اختر بولا ''ہم چاند دیکھ رہے ہیں تو کیا اماں بھی چاند کو دیکھ رہی ہوگی؟''
''ہاں پرمیشر سنگھ کی آواز میں گونج تھی...... ''چلو گے اماں کے پاس؟''
''ہاں'' اختر بولا...... ''پر تم جاتے نہیں، تم بہت برے ہو، تم سکھ ہو۔''
پرمیشر سنگھ بولا...... ''نہیں بیٹے، آج تو تمھیں ضرور ہی لے جاؤں گا۔ تمھاری اماں کی چٹھی آئی ہے۔ وہ کہتی ہے میں اختر بیٹے کے لیے اداس ہوں۔''
''میں بھی تو اداس ہوں۔'' اختر کو جیسے کوئی بھولی ہوئی بات یاد آگئی۔
''میں تمھیں تمھاری اماں ہی کے پاس لیے جا رہا ہوں۔''
''سچ......؟'' اختر پرمیشر سنگھ کے کندھے پر کودنے لگا اور زور زور سے بولنے لگا...... ''ہم اماں پاس جا رہے ہیں۔ پرموں ہمیں اماں پاس لے جائے گا۔ ہم وہاں سے پرموں کو چٹھی لکھیں گے۔''

پرمیشر سنگھ چپ چاپ روئے جا رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر اور گلا صاف کر کے اس نے اختر سے پوچھا۔
''گانا سنو گے؟''
''ہاں''
''پہلے تم قرآن سناؤ۔''
''اچھا'' اور اختر قُل ھو اللّٰہ پڑھنے لگا، کفواً احد پر پہنچ کر اس نے اپنے سینے پر چھو، کی اور بولا...... ''لاؤ تمھارے سینے پر بھی چھو، کر دوں۔''
رک کر پرمیشر سنگھ نے گریبان کا ایک بٹن کھولا اور اوپر دیکھا۔ اختر نے لٹک کر اس کے سینے پر چھو، کر دی اور بولا...... ''اب تم سناؤ۔''
پرمیشر سنگھ نے اختر کو دوسرے کندھے پر بٹھا لیا۔ اسے بچوں کا کوئی گیت یاد نہیں تھا۔ اس لیے اس نے قسم قسم کے گیت گانا شروع کیے اور گاتے ہوئے تیز تیز چلنے لگا۔ اختر چپ چاپ سنتا رہا۔

جتو دا اس سر بن ورگا جے
جتو دامنہ ورگا جے
جتو دا لک چترا جے
لوکو
جتو دا لک چترا

''جتو کون ہے؟'' اختر نے پرمیشر سنگھ کو ٹوکا۔
پرمیشر سنگھ ہنسا پھر ذرا وقفے کے بعد بولا...... ''میری بیوی ہے نا۔ امر کور کی ماں۔ اس کا نام جتو ہے۔ امر کور کا نام بھی جتو ہے۔ تمھاری اماں کا نام بھی جتو ہی ہوگا۔''

"کیوں؟" اختر خفا ہو گیا..... "وہ کوئی سکھ ہے؟"

پریمیشر سنگھ خاموش ہو گیا۔

چاند بہت بلند ہو گیا تھا۔ رات خاموش تھی، کبھی کبھی گنے کے کھیتوں کے آس پاس گیدڑ روتے اور پھر سناٹا چھا جاتا۔ اختر پہلے تو گیدڑوں کی آواز سے بہت ڈرا، مگر پریمیشر سنگھ کے سمجھانے سے بہل گیا اور ایک بار خاموشی کے طویل وقفے کے بعد اس نے پریمیشر سنگھ سے پوچھا..... "اب کیوں نہیں روتے گیدڑ؟" پریمیشر سنگھ ہنس دیا۔ پھر اسے ایک کہانی یاد آ گئی۔ یہ گرو گوبند سنگھ کی کہانی تھی۔ لیکن اس نے بڑے سلیقے سے سکھوں کے ناموں کو مسلمانوں کے ناموں میں بدل دیا اور اختر "پھر؟ پھر؟" کی رٹ لگاتا رہا اور کہانی ابھی جاری تھی، جب اختر ایک دم بولا "ارے چاند تو سر پر آ گیا!"

پریمیشر سنگھ نے بھی رک کر اوپر دیکھا۔ پھر وہ قریب کے ٹیلے پر چڑھ کر دور دیکھنے لگا اور بولا ..... "تمھاری اماں کا دیس جانے کدھر چلا گیا۔"

وہ کچھ دیر ٹیلے پر کھڑا رہا۔ جب اچانک کہیں دور سے اذان کی آواز آنے لگی اور اختر مارے خوشی کے یوں کودا کہ پریمیشر سنگھ سے بڑی مشکل سے سنبھالا جا سکا۔ اسے کندھے پر سے اتار کر وہ زمین پر بیٹھ گیا اور کھڑے ہوئے اختر کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر بولا..... جاؤ بیٹے، تمھیں تمھاری اماں نے پکارا ہے۔ بس تم اس آواز کی سیدھ میں....."

"شش!" اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ دی اور سرگوشی میں بولا۔

"اذان کے وقت نہیں بولتے۔"

"پر میں تو سکھ ہوں بیٹے!" پریمیشر سنگھ بولا۔

"شش" اب کے اختر نے بگڑ کر اسے گھورا۔

اور پریمیشر سنگھ نے اسے گود میں بٹھا لیا۔ اس کے ماتھے پر ایک بہت طویل پیار دیا اور اذان ختم ہونے کے بعد آستینوں سے آنکھیں رگڑ کر بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں یہاں سے آگے نہیں آؤں گا۔ بس تم....."

"کیوں.....؟ کیوں نہیں آؤ گے.....؟ اختر نے پوچھا۔

"تمھاری اماں نے چٹھی میں یہی لکھا ہے کہ اختر اکیلا آئے۔"

پریمیشر سنگھ نے اختر کو پھسلایا..... "بس تم سیدھے چلے جاؤ۔ سامنے ایک گاؤں آئے گا۔ وہاں جا کر اپنا نام بتانا کرتارا نہیں اختر، پھر اپنی ماں کا نام بتانا۔ اپنے گاؤں کا نام بتانا اور دیکھو، مجھے ایک چٹھی ضرور لکھنا۔"

"لکھوں گا" اختر نے وعدہ کیا۔

"اور ہاں تمھیں کرتارا نام کا کوئی لڑکا ملے نا، تو اسے ادھر بھیج دینا۔"

"اچھا" پریمیشر سنگھ نے ایک بار پھر اختر کا ماتھا چوما اور جیسے کچھ نگل کر بولا۔

"جاؤ!"

اختر چند قدم چلا مگر پلٹ آیا..... "تم بھی آ جاؤ نا۔"

"نہیں بھئی!" پریمیشر سنگھ نے اسے سمجھایا..... "تمھاری اماں نے چٹھی میں یہ نہیں لکھا۔"

"مجھے ڈر لگتا ہے۔" اختر بولا۔

"قرآن کیوں نہیں پڑھتے؟" پریمیشر سنگھ نے مشورہ دیا۔

"اچھا" بات سمجھ میں آ گئی اور وہ قُل ھو اللہ کا ورد کرتا ہوا جانے لگا۔

نرم نرم پو افق کے دائرے پر اندھیرے سے لڑ رہی تھی اور ننھا سا اختر دور دھندلی پگڈنڈی پر ایک لمبے تڑنگے سکھ جوان کی طرح تیز تیز جا رہا تھا۔ پریمیشر سنگھ اس پر نظریں گاڑے ٹیلے پر بیٹھا رہا اور جب اختر کا نقطہ فضا کا ایک حصہ بن گیا تو وہاں سے اتر آیا۔

اختر ابھی گاؤں کے قریب نہیں پہنچا تھا کہ دو سپاہی لپک کر آئے اور اسے روک کر بولے۔ "کون ہو تم؟"

"اختر۔"

وہ یوں بولا جیسے ساری دنیا اس کا نام جانتی ہے۔

"اختر!" دونوں سپاہی کبھی اختر کے چہرے کو دیکھتے اور کبھی اس کی سکھوں کی سی پگڑی کو۔ پھر ایک نے آگے بڑھ کر اس کی پگڑی جھٹکے سے اتار لی تو اختر کے کیس کھل کر ادھر ادھر بکھر گئے۔

اختر نے جھنا کر پگڑی چھین لی اور پھر ایک ہاتھ سے سر کو ٹٹولتے ہوئے وہ زمین پر لیٹ گیا اور زور زور سے روتے ہوئے بولا "میرا کنگھا لاؤ۔ تم نے میرا کنگھا لے لیا ہے۔ دے دو ورنہ میں تمھیں ماروں گا۔"

ایک دم دونوں سپاہی دھپ سے زمین پر گرے اور رائفل کو کندھوں سے لگا کر جیسے نشانہ باندھنے لگے۔

"ہالٹ۔"

ایک پکارا جیسے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ پھر بڑھتے ہوئے اجالے میں انھوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک نے فائر کر دیا۔ اختر فائر کی آواز سے دہل کر رہ گیا اور سپاہیوں کو ایک طرف بھاگتا دیکھ کر وہ بھی روتا چلاتا ہوا ان کے پیچھے بھاگا۔

سپاہی جب ایک جگہ جا کر رکے تو پریمیشر سنگھ اپنی ران پر کس کر پٹی باندھ چکا تھا مگر خون اس کی پگڑی کی سیکڑوں پرتوں میں سے بھی پھوٹ آیا۔ اور وہ کہہ رہا تھا..... "مجھے کیوں مارا تم نے، میں تو اختر کے کیس کاٹنا بھول گیا تھا؟ میں اختر کو اس کا دھرم واپس دینے آیا تھا یارو۔"

اور اختر بھاگا آ رہا تھا اور اس کے کیس ہوا میں اڑ رہے تھے۔

□□□

زبیر رضوی

فسادات اور اردو کا افسانوی ادب

1947 میں ملک کی تقسیم کے وقت مارکاٹ کا جو بازار گرم ہوا تھا، جو خون خرابہ ہوا، اپنے گھربار کو چھوڑ کر جن لوگوں نے شرنارتھی کیمپوں میں پناہ لی تھی، جو لوٹے گئے تھے اور اپنے رشتے داروں اور عزیزوں کو کھو دینے کا رنج اور دکھ جھیلا تھا اس پر دوسری ہندوستانی زبانوں کے مقابلے میں اردو میں کچھ زیادہ ہی لکھا گیا اور اب تک لکھا جا رہا ہے۔ جس طرح ہندوستانی زندگی میں دلتوں کے ساتھ ہونے والا توہین آمیز سلوک اور برتاؤ آج ہندی، مراٹھی اور گجراتی ادب میں ایک مستقل موضوع کی حیثیت حاصل کر لیا گیا ہے اسی طرح اردو میں ''فسادات'' نے بھی ایک مستقل موضوع کی صورت اختیار کر لی ہے۔ اس کی گونج شاعری میں کم اور افسانے میں زیادہ سنائی دیتی ہے۔ کچھ افسانہ نگاروں نے اپنا سماجی اور قومی فریضہ انجام دینے کی نیت سے فسادات پر لکھا اور کچھ نے عوامی رو کے اثرات قبول کرتے ہوئے دردمندی کے جذبے سے فسادات پر لکھا مگر یہ افسانے ایک فیصلہ کن ادبی اور خاص طور سے تخلیقی رویے سے خالی تھے۔ جس طرح جنگ کے زمانے میں ادیب وطن پرستی اور قومی تقاضوں کے دباؤ میں اپنا فریضہ انجام دینے کی خاطر لکھتے رہے ہیں اور حالات کے معمول پر آنے کے بعد وہ پھر ادب اور اپنے تخلیقی سوتوں کی طرف واپس لوٹ جاتے ہیں تو اردو میں کچھ افسانے تو اسی انداز سے لکھے گئے ہیں۔

فسادات پر مختلف حالات میں لکھے گئے افسانوں پر تفصیلی اظہار خیال سے پہلے یہ بات بھی صاف کر لیں کہ کیا فسادات ادب کا موضوع بن سکتے ہیں؟ اگر ہم فسادات کو محض انسانوں کی آپسی مارکاٹ اور ایک دوسرے سے نفرت کرنے اور خون کا پیاسا ہونا سمجھیں تو پھر یہ دائرہ چھوٹا ہو جائے گا۔ فسادات جس طرح نفرت کے بیج بوتے ہیں، انسان کے داخل کو نیکی اور اچھائی سے کنگال کر دیتے ہیں، مذہب، رنگ، نسل اور ذات پات اور اس کی تفریق کے طوفان میں گھرے انسان کو فسادات جس طرح ایک شیطان ایک درندہ بنا دیتے ہیں وہ اگر افسانے یا شاعری میں ایک گہرے رنگ کے طور پر نہیں ابھرتا تو پھر بات بنتی نہیں۔ وہ پھر کرشن چندر کا افسانہ ''پشاور ایکسپریس'' بن جاتا ہے۔ سرحد کے ادھر بھی اور ادھر بھی برابر برابر کی گنتی میں ہندو مسلمان مارے جاتے ہیں۔ یہ افسانہ ترازو کے دونوں پلڑے برابر رکھتا ہے۔ اس کے برخلاف منٹو کا افسانہ ''کھول دو'' دل پر نقش ہو کے رہ جاتا ہے اور ادب کے اونچے خانے میں جگہ پاتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم میں فرانس کے کچھ ادیبوں نے جرمنی کے خلاف مورچہ سنبھالتے ہوئے خفیہ طور سے ''آدمی رات چھپنے والی کتابیں'' نام کا ایک سلسلہ شائع کیا تھا۔ جنگ کے بعد ان ادیبوں کو انعام و اکرام دینے کی بات چلی تو خالص ادب لکھنے والے ان ادیبوں نے انعام و اعزاز لینے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ انھوں نے جنگ کے دنوں میں جو کچھ بھی لکھا تھا وہ پروپیگنڈہ تھا اور وطن پرستی کے جذبے اور اس کے بہاؤ میں لکھا تھا۔ اس کے لیے انعام کیسا؟ آندرے ژید نے بھی وطن پرستی کے جوش میں کافی کچھ لکھا تھا۔ فرق اتنا تھا کہ وہ جرمنی کی تعریف بھی کرتا رہا تھا۔ شاید آندرے ژید اور دوسرے فرانسیسی ادیبوں کا رویہ ویسا ہی تھا جو ایک ادیب کو قومی بحران کے دنوں میں اپنانا ہوتا ہے۔ یہ لازمی نہیں کہ کوئی بات سچ یا جھوٹ ہو، بات سچ اور جھوٹ دونوں ہی ہو سکتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کا تذبذب قابل فہم ہے اور میں ایک ادیب کے ناطے اسے آرٹ کے وسیلے سے کھوجنے پر اصرار کروں گا لیکن ایک شہری کی حیثیت سے میں قطعی لہجے میں یہ سوال کروں گا کہ سچ کیا ہے؟ اور جھوٹ کیا ہے''؟

اگر لکھے ہوئے میں لکھنے والے کا خلوص اور ایمانداری شامل نہیں تو اس کا لکھا ہوا بے جان بھی ہوگا اور بے اثر بھی۔ ٹی ایس ایلیٹ نے ادیبوں کی انھی دو حیثیتوں کی بات کرتے ہوئے ایک شہری کی حیثیت سے لکھے ہوئے کو بھی اہم مانا تھا اور اس کی معنویت (relevance) کا اعتراف کیا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ فسادات پر کیسے افسانے لکھے گئے اور جو اب بھی لکھے جا رہے ہیں ان میں کیا کوئی فرق ہے اور اگر ہے تو وہ کس نوعیت کا ہے؟ اردو میں فسادات پر لکھے کچھ افسانے تو وہ ہیں جو ملک کی تقسیم کے وقت پھوٹ پڑنے والے فسادات کو محور بناتے ہیں، کچھ وہ ہیں جو بابری مسجد کے گرائے جانے سے پہلے اور کچھ اس کے بعد ہونے والے فسادات پر لکھے گئے۔ اس میں کئی افسانہ نگار ایسے بھی ہیں جو خود اس طوفان سے گزرے تھے۔ یہ المیہ ایسا ہولناک تھا کہ بہتوں کی سمجھ میں ہی نہیں آیا کہ وہ اس المیے کو افسانہ کیسے بنائیں اور اس کو ایک تخلیق کا روپ کیسے دیں؟ اس تذبذب میں ایسے افسانے بھی لکھے گئے جو صحافیانہ جذباتیت کا شکار ہوئے۔ بے اثر، بے جان اور اوپر سے موضوع کو چھو کر گزر جانے والے، افسانہ نگار نے یہ نکتہ فراموش کر دیا کہ واقعہ یا المیہ اگر ذہنی تجربہ (mental agony) نہیں بن پاتا تو پھر تخلیق کچی رہ جاتی ہے۔ اس حوالے سے بات کرتے ہوئے کرشن چندر کے فسادات پر لکھے وہ افسانے مثال بن جاتے ہیں جو ''ہم وحشی ہیں'' میں شامل ہیں۔ کرشن چندر فسادات میں انسان کے دکھ کے بجائے مسلمان کے دکھ اور ہندو کے دکھ کی بات کرتے

ہیں۔ ان کے یہاں فسادات کو اسی فارمولے کے تحت دیکھا گیا جو زیادہ تر ترقی پسند ادیبوں نے اس موضوع پر افسانے لکھتے ہوئے اپنایا تھا۔ کرشن چندر اور خواجہ احمد عباس دونوں نے فسادات پر افسانے لکھتے ہوئے ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کو یکساں قصوروار ٹھہراتے ہوئے فسادات کے خون خرابے کا انھی فرقوں کو ذمے دار ٹھہرایا تھا۔ خواجہ احمد عباس کے افسانے ''انتقام'' اور ''سردار جی'' میں افسانہ نگار کا رویہ بڑی حد تک ایک لاتعلق مشاہد کا تھا جو بات کی تہہ تک پہنچنے کے عمل سے نہیں گزرتا۔ اس نسل کے دیگر لکھنے والے عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، احمد ندیم قاسمی، منٹو، اور رامانند ساگر اپنی فنکارانہ سوچ کے ساتھ لکھ رہے تھے۔ بظاہر ان ادیبوں کے افسانوں کے کردار ہندو اور مسلمان ہیں مگر کیا حقیقت میں رامانند ساگر کی کہانی ''بھاگ ان بردہ فروشوں سے'' کی خود کو راوی ندی کی لہروں کے سپرد کرنے والی ہیروئن ہندو ہے؟ کیا منٹو کے افسانے ''کھول دو'' کی سکینہ ایک مسلمان لڑکی ہے؟ عصمت چغتائی کا افسانہ ''جڑیں'' انسانی زندگی کا افسانہ ہے جس میں ایک مسلمان گھر کی جیتی جاگتی تصویریں ہمیں نظر آتی ہیں۔ پہلے زندگی کی وہ ہلچل ہے جب گھر والے پاکستان جانے کی تیاری میں لگے ہیں۔ بھرا بھرا گھر سنسان ہو جاتا ہے۔ بوڑھی ماں اولاد کے چلے جانے کے بعد تنہا رہ جاتی ہے۔ ''جڑیں'' کی طرح عصمت کی اسی موضوع پر لکھی ایک اور کہانی ''دھانی بانکپن'' میں بھی ایک گھر ہندو کا اور دوسرا ملا ہوا گھر مسلمان پڑوسی کا ہے اور یہ دونوں بڑے پرانے پڑوسی ہیں۔ ان میں بڑا میل جول ہے۔ یہاں پنڈت جی کا کردار بڑا اہم ہے۔ وہ جانے والے قافلے کو واپس بلا لاتے ہیں اور ان کے ہاتھ پر خاموش اور شکر گزار بوڑھی آنکھوں کے آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔

عزیز احمد کا افسانہ ''کالی رات'' دل کو چھونے والا افسانہ ہے۔ ریل کے ایک ڈبے میں ایک نیا شادی شدہ جوڑا ہے۔ گاڑی فسادیوں نے روک لی ہے۔ یہ خطرے کی گھنٹی ہے، دولھا کے پاس ریوالور ہے جس میں صرف دو گولیاں ہیں۔ دولھا دلہن کو باہوں میں سمیٹ کر سینے سے لگا لیتا ہے۔ اسے احساس ہے کہ وہ مار دیا جائے گا اور دلہن بے آبرو کی جائے گی۔ دونوں کے ہونٹ آخری بار ملتے ہیں۔ دولھا، دلہن کی کنپٹی سے ریوالور لگا کر فائر کر دیتا ہے۔ حیات اللہ انصاری کی کہانی ''شکر گزار آنکھیں'' میں بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ کالی رات میں دولھا، دلہن کو اپنے ریوالور سے ہلاک کر دیتا ہے۔ اس دوسری کہانی میں زخمی دولھا، دلہن کی گود میں ہے۔ دلہن آبرو لوٹنے کے درپے فسادیوں سے منت کرتی ہے۔ میری تم سے ایک پرارتھنا ہے صرف ایک پرارتھنا، مجھے ابھی ان کے سامنے مار دو۔ ایک آدمی دلہن کی پرارتھنا سن لیتا ہے اور تلوار کا ایک بھرپور وار ہوتا ہے۔ دلہن گر جاتی ہے اور اس کی شکر گزار آنکھیں قاتل کی طرف اٹھتی ہیں۔ دلہن دولھا پر محبت بھری نظر جمائے ختم ہو جاتی ہے۔ بقول ممتاز شیریں اس کہانی میں آدمی کے دو Self پیش ہوئے ہیں۔ ایک Self فرقہ پرست ہندو کا ہے اور دوسرا انسان کا۔ مرتی ہوئی دلہن کی شکر گزار آنکھیں ہر وقت اس کا پیچھا کرتی ہیں اور وہ اپنے پہلے Self کو مار ڈالتا ہے۔

اپندر ناتھ اشک کا افسانہ ''ٹیبل لینڈ'' اور سہیل عظیم آبادی کا افسانہ ''اندھیرے میں ایک کرن'' یہ احساس دلاتے ہیں کہ اس وقت جب انسان وحشی اور درندہ ہو گیا تھا تب بھی انسانیت زندہ تھی۔ یہ دونوں افسانے اسی خیال پر مرکوز ہیں کہ فسادات میں بھی ایسے انسان تھے جو فسادات کے دھارے کے ساتھ نہیں بہے وہ مخالف سمت میں بہنے والے وہ انسان تھے جو دوسرے فرقے کے افراد کی جان و مال بچانے میں لگے تھے۔ ان افسانوں میں آزمائش کی گھڑی میں یہ انسان دوستی کچھ ایسے حقیقی انداز میں واقعات کا حصہ بنتی ہے کہ پڑھنے والا ایک داخلی مسرت کے ساتھ ایسے انسانی سلوک کے ہونے پر کوئی سوالیہ نشان نہیں لگاتا، افسانے پر یقین کر لیتا ہے۔

فسادات پر لکھے یہ کچھ وہ افسانے تھے جو ملک کی تقسیم کے وقت ہونے والے خون خرابے پر لکھے گئے۔ ان افسانوں میں احمد ندیم قاسمی کا افسانہ ''پرمیشر سنگھ'' ایک ایسے مسلمان بچے کی کہانی ہے جسے ایک رحم دل سکھ فسادیوں کے ہاتھوں سے بچا لیتا ہے اور اپنے گھر لے آتا ہے۔ پرمیشر سنگھ اس مسلمان بچے اختر کا بڑا خیال رکھتا ہے۔ اس کا اپنا اتنی ہی عمر کا لڑکا کرتار سنگھ تھا جسے فسادیوں نے اغوا کر لیا تھا۔ اختر میں پرمیشر سنگھ اپنے کھوئے ہوئے بچے کی پرچھائیں دیکھ کر جی اٹھتا تھا۔ اسے خیال آیا کہ اختر ایک مسلم بچے کی پہچان کے ساتھ سکھوں کی آبادی والے گاؤں میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ اسے پگڑی پہناتا ہے، اس کے کیس بڑھنے لگتے ہیں، ان میں کنگھا بھی لگا دیتا ہے اور ساتھ میں کڑا بھی پہنا دیا جاتا ہے مگر اختر کی ماں نے اس کے اندر جس مذہب کا بیج بویا تھا اسے جڑ سے اکھاڑ پھینکنا پرمیشر سنگھ کی تمام کوششوں کے باوجود ممکن نہ ہو پایا اور ایک دن پرمیشر اپنے گاؤں سے ملی پاکستان کے ایک گاؤں کی سرحد پر اختر کو یہ کہہ کر چھوڑ دیتا ہے کہ اس گاؤں میں اس کی ماں رہتی ہے اور اس کی ماں نے اسے بلایا ہے۔ اختر گاؤں کی طرف بھاگتا ہے پہرے دار سپاہی اس سے سوال جواب کرتے ہیں۔ اختر کے نام بتانے پر وہ اس کی سرداروں والی پگڑی کو شک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ پگڑی اترتی ہے تو اختر کے لمبے لمبے کیس ہوا میں لہرانے لگتے ہیں۔ سپاہی دور اپنے گاؤں کے کنارے کھڑے پرمیشر سنگھ پر فائر کرتے ہیں جو دراصل اختر کو اس کا مذہب واپس کرنے کے خیال سے سرحد سے ملے پاکستانی گاؤں کی طرف اسے چھوڑنے آیا تھا لیکن اختر اپنے کھلے کیسوں کے ساتھ سپاہیوں سے ڈر کر واپس پرمیشر سنگھ کی جانب بھاگتا نظر آتا ہے۔ افسانہ نگار نے فسادات کے دوران جان بچانے کے لیے تبدیلی مذہب کے راستے کی نشان دہی کر کے یہ جتانا چاہا ہے کہ مذہبی روح اگر ایک مرتبہ خون کا حصہ بن جائے تو پھر اسے بے دخل کر کے

اس میں کسی دوسرے عقیدے کا بیج بونا ایک مشکل کام ہے۔ مگر فساد کا شکار ہونے والے کے لیے زندہ رہنے کا یہی راستہ رہ جاتا ہے کہ وہ آمادگی یا پھر غیر آمادگی کے ساتھ اس طرح کے خارجی دباؤ کو قبول کر لے۔ یہ صورت حال آج بھی ایسے ہی حالات میں زندہ ہے اور بے سہارا بچ جانے والوں کا مقدر بنی ہوئی ہے۔ پچھلے سکھ فسادات بھی ایسے واقعات کی گواہیاں فراہم کرتے ہیں۔ فسادات میں جس نے سب سے زیادہ ظلم جھیلا وہ عورت ہے۔ اس کے المیے کو جن افسانوں میں پوری فنی مہارت کے ساتھ بیان کیا گیا ان میں منٹو کا افسانہ ''کھول دو'' اور قدرت اللہ شہاب کا افسانہ ''یا خدا'' ہے اور یہ دونوں بے پناہ افسانے ہیں۔ ''یا خدا'' اور ''کھول دو'' دونوں ہی شرنارتھیوں کے لیے کھولے گئے کیمپوں میں بے سہارا اور تنہا رہ جانے والی عورتوں اور لڑکیوں کی بار بار آبرو ریزی کیے جانے کی بڑی دردناک کہانیاں ہیں۔ ادب کے قارئین اس نکتے سے آگاہ ہیں کہ کسی بھی بحران یا آزمائش کے بیچ رہ کر جو ادب پیدا ہوتا ہے اس کے مقابلے وہ ادب زیادہ زندہ اور دوامی تاثر کا حامل ہوتا ہے جو بحران کے گزر جانے کے بعد وقت کا فاصلہ دے کر لکھا جاتا ہے۔ اس کی سب سے اچھی مثال راجندر سنگھ بیدی کا افسانہ ''لاجونتی'' ہے۔ اس افسانے میں بیدی خون خرابے کی بات نہیں کرتے۔ یہاں افسانہ نگار کی ساری توجہ اس بات پر ہے کہ وہ عورت جو فسادات میں بے گھر ہوئی، لوٹی گئی اور جب کافی وقت اور عرصہ گزرنے کے بعد وہ اپنے شوہر کو لوٹائی جاتی ہے تو دونوں کے بیچ کیا کچھ ٹوٹتا پھوٹتا اور جڑتا ہے۔ افسانہ شوہر، اور فسادات میں ٹوٹی بکھری بیوی کے دوبارہ مل جانے کی ایسی بے شمار کیفیات اور جذبات کی رمزیت سے پردے اٹھاتا اور ان کے بھید کھولتا ہے کہ جو عام حالات میں انسانی نفسیات کا حصہ نہیں ہوتے۔ یہ افسانے ایک دوسرے کو اچھی طرح جاننے والے مرد اور عورت کے بدلے ہوئے حالات میں ایک دوسرے کو پانے کا بیانیہ ہے جو خارج میں فسادات میں اغوا کی گئی عورتوں کی بازیابی اور ان کی باز آبادکاری سے تعلق رکھتا ہے لیکن ہندوستان جیسے سخت گیر اور وہمی اور لکیر کے فقیر معاشرے میں یہ کیسے ممکن ہو پایا کہ فساد میں اغوا ہونے والی لاجونتی اپنے پتی کے لیے قابل قبول ہوگئی۔ بیدی کی فنی مہارت اس صورت حال کو بے حد اثر آفرینی کے ساتھ قاری کے لیے قابل قبول بناتی ہے۔

فسادات پر سب سے انوکھا اور مثالی افسانہ اشفاق احمد کا ''گڈریا'' ہے۔ یہ ایک طویل افسانہ ہے ''یا خدا'' کی طرح، لیکن یہ سارا افسانہ پڑھتے ہوئے یہ لگتا ہی نہیں کہ ہم فسادات پر لکھے افسانے پڑھ رہے ہیں۔ داؤجی کا کردار سارے افسانے پر چھایا ہوا ہے اور داؤجی وہ ہیں جو اردو، فارسی اور سنسکرت تہذیب میں پلے بڑھے ہیں۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے رسم و رواج اور ان کے مذہب سے تعلق رکھنے والی ساری باتوں سے یکساں واقفیت رکھتے ہیں۔ فراق کی شاعری کی طرح داؤجی کی شخصیت بھی مشترکہ تہذیب کے خمار و خمیر میں رچی بسی ہے۔ انسانی رشتوں اور ان کی اخلاقی قدروں میں داؤجی ڈوبے ہوئے ہیں اس لیے کہیں کچھ الٹا سیدھا ہوتا ہے تو داؤجی پریشان ہو اٹھتے ہیں۔ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ داؤجی سارے جہاں کے درد میں گرفتار رہتے ہیں۔ انھیں سب منشی جی کہتے ہیں۔ وہ کلاس میں فیل ہونے والے اپنے ایک مسلمان دوست کے لڑکے کو اپنی سرپرستی اور نگرانی میں لے لیتے ہیں اور اپنے گھر لے آتے ہیں۔ داؤجی کا اب نشانہ یہ ہے کہ وہ لڑکا اپنے اسکول اور کلاس میں ٹاپ کرے۔ داؤجی اُس کے مستقبل کو شاندار بنانے کا ارادہ کرکے اسے وقت بے وقت پڑھنے لکھنے پر آمادہ کرتے رہتے ہیں۔ سوتے جاگتے اُس سے کبھی گرامر کے، کبھی حساب کے سوال پوچھتے رہتے ہیں۔ گولو کی زبان سے داؤجی کا حال سنیے۔ افسانہ یہیں سے شروع بھی ہوتا ہے۔

''یہ سردیوں کی ایک یخ بستہ اور طویل رات کی بات ہے، میں اپنے گرم گرم بستر میں سر ڈھانپے گہری نیند سو رہا تھا کہ کسی نے زور سے مجھے جھنجھوڑ کر جگا دیا۔ کون ہے؟ میں نے چیخ کر پوچھا اور میرے سوال کے جواب میں ایک بڑا سا ہاتھ میرے سر سے ٹکرایا اور گھپ اندھیرے سے آواز آئی ''تھانے والے نے نورا کو گرفتار کر لیا'' ''کیا'' میں نے لرزتے ہوئے ہاتھ کو پرے دھکیلنا چاہا۔ کیا ہے؟ اور تاریکی کا بھوت بولا'' تھانے والوں نے نورا کو گرفتار کر لیا'' اس کا فارسی میں ترجمہ کرو۔ داؤجی کے بچے۔ میں نے اونگھتے ہوئے کہا'' آدھی آدھی رات کو تنگ کرتے ہو، دفع ہوجاؤ۔ میں نہیں۔ میں نہیں آپ کے گھر رہتا، میں نہیں پڑھتا، داؤجی کے بچے، کتے!'' میں رونے لگا۔ داؤجی نے چمکار کر کہا'' اگر پڑھے گا نہیں تو پاس کیسے ہوگا؟ پاس نہیں ہوگا تو بڑا آدمی نہیں بن سکے گا۔ پھر لوگ تیرے داؤجی کو کیسے جانیں گے؟'' ''اللہ کرے سب مر جائیں۔ آپ بھی، آپ کو جاننے والے بھی اور میں بھی۔ میں بھی۔'' میں بھی اپنی جواں مرگی پر ایسا رویا کہ دو ہی لمحوں میں گھگھی بندھ گئی۔''

ساری کہانی داؤجی کے ایسے ہی برتاؤ کے گرد گھومتی ہے۔ وہ گولو کے باپ بھی ہیں، استاد بھی اور دوست بھی۔ گولو کے لاکھ برا بھلا کہنے پر بھی داؤجی اسے بڑا آدمی بنانے کے ارادے اور مقصد کو نہیں بھولتے۔ افسانے کے آخری اوراق میں علاقے کا ایک برا کردار ''نورا'' فرقہ پرست ٹولے کے ساتھ داؤجی کو گھیر لیتا ہے اور ان کی پگڑی اچھال دیتا ہے، ان کی چوٹی کاٹ ڈالتا ہے اور کلمہ پڑھنے کو کہتا ہے۔ داؤجی پوچھتے ہیں کون سا کلمہ؟ نورا، داؤجی کے تھپڑ مار کر کہتا ہے۔'' سالے، کلمے بھی کوئی پانچ سات ہوتے ہیں؟'' داؤجی کلمہ پڑھتے ہیں اور تب نورا اپنی بکریوں کا ریوڑ داؤجی کو ہانکنے کے لیے کہتا ہے۔ یہاں افسانہ نگار نے یہ ایک جملہ لکھ کر افسانہ ختم کر دیا۔

''ننگے سر داؤجی بکریوں کے پیچھے یوں چلے جیسے لمبے لمبے بالوں والا فریدا چل رہا ہو۔''

نورا کتنا مسلمان تھا اور داؤجی کتنے ہندو، افسانہ اسی بھید کو اس آخری

جسلے میں کھولتا ہوا ختم ہو جاتا ہے۔" جیسے فرید اچل رہا ہو" اس مجلے نے داؤجی کی شخصیت کو ایک صوفی سنت کی سی روایت دے دی۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ بٹوارے کے بعد مذہب کے نام پر نفاق اور نفرت کی آگ سرد پڑ جاتی اور سیکولر ہندوستان کے نئے نظام حیات میں فرقہ پرستی کی گونج فسادات کی صورت میں سنائی نہ دیتی مگر ایسا نہیں ہوا اور کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی بہانے فسادات کی آگ بھڑکتی رہی، زخم ہرے ہوتے رہے۔ ان فسادات کے بارے میں جو افسانہ لکھا گیا وہ بٹوارے کے وقت لکھے گئے افسانے سے بڑا مختلف تھا کیونکہ فسادات ہونے کی وجوہ بدلتی رہیں اور ساتھ ہی ان کے بارے میں افسانہ نگار کا رویہ بھی بدلتا رہا۔ وہ سیاسی جماعتیں بھی پہچان لی گئیں جو فسادات کی آگ لگاتی رہتی تھیں۔ اب فسادات میں لٹنے اور تباہ ہونے والے کے ساتھ افسانہ نگار کی ہمدردیاں اور اس کی تباہی کے ذمہ داروں کو سزا دینے کا مطالبہ بھی افسانے میں ایک خاموش خواہش کے طور پر در آیا۔ بعض افسانوں میں یہ بھی ہوا کہ متاثرہ افراد اور فرقوں نے جس ہمت سے اپنی باز آبادکاری کی، پھر سے پیروں پر کھڑا ہونے کا حوصلہ کیا اور اس شہر یا بستی کو نہیں چھوڑا کہ جہاں وہ فرقہ پرستی کا شکار بنے، ایسے افسانوں میں غلام جیلانی کا افسانہ "پنجرا" بڑا روشن افسانہ ہے۔

پہلے کے افسانوں میں ہندو مسلمان کی اور مسلمان ہندو کی جان و مال کی حفاظت کرتے ہیں لیکن بعد کے فسادات میں افسانہ نگار نے یہ محسوس کیا کہ وہ فسادات جب بھی بھڑکتے ہیں تو ہندو مسلمان کے آپسی میل جول میں ایک فاصلہ سا آ جاتا ہے، باہمی رشتوں اور تعلقات میں انجانے اور جانے انداز میں ایک تناؤ اور بے اعتمادی راہ پا جاتی ہے، گرم جوشی اور بے تکلف دوستانہ فضا میں ایک طرح کا روکھا پن اور کسی حد تک نیتوں پہ شک بھی ہونے لگتا ہے۔ آپسی تعلقات میں اسی طرح کے سائے ہمیں" مجرم"(جیلانی بانو)" بالکونی" (سریندر پرکاش) جیسے افسانوں میں لہراتے محسوس ہوتے ہیں۔ بابری مسجد کے گرائے جانے کے واقعے نے ہمارے افسانہ نگاروں اور دانش وروں، دونوں طبقے کو اندر تک ہلا دیا تھا۔ ہندی میں جس طرح "انت میں پرارتھنا" "ترشول" اور "کبرو" جیسے افسانے لکھے گئے، اردو میں اس واقعے کی گونج "نیو کی اینٹ" (حسین الحق) "سنگھاردان" (شموئل احمد) اور "زندہ درگور" (ساجد رشید) جیسے افسانوں میں سنائی دیتی ہے۔ فسادات نے ہماری زندگی اور سائیکی میں ایک مستقل دہشت اور لوٹ لیے جانے کا خوف اور ڈر بٹھا دیا ہے۔ خاص طور سے یہ خوف اور ڈر اس فرقے کی نفسیات کا حصہ ہی بن گیا ہے جسے فسادات میں اکثر نشانہ بنایا جاتا ہے۔ وہ مکان بناتے ہوئے، کاروبار کرتے ہوئے یا اکیلے اپنے خاندان کے ساتھ کسی کالونی میں رہتے ہوئے گھبراتا ہے۔ یہی ڈر اور اندیشہ اور اپنے اردگرد کے ماحول پر بے اعتمادی اور غیر محفوظ ہونے کا یہ احساس "بغیر آسمان کی زمین" (الیاس احمد گدی) "آدمی" (سید محمد اشرف) "نیلا خوف" (شفق) جیسے افسانوں میں محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اودے پرکاش کی ہندی کہانی "انت میں پرارتھنا" میں یہ خدشہ بھی ظاہر کیا گیا تھا کہ اگر فسادات کا نشانہ اور شکار ہونے والے فرقے کو سماج اور حکومت دونوں سطح پر اس کے جان و مال کی ضمانت یا یقین دہانی نہیں ملتی تو اس کا امکان ہے کہ اس مظلوم فرقے کے افراد دہشت گردی کے جال میں پھانس لیے جائیں، "سانپوں سے نہ ڈرنے والا بچہ" (شوکت حیات) افسانہ اسی خدشے کو آنچ دینے والا افسانہ ہے۔

المیہ یہ ہے کہ 1947 سے اب تک ہماری سیاست فسادات کرانے والے کو پہچاننے اور اسے ننگا کرنے میں آگے آنے سے کتراتی رہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ فسادات کرانا اس ملک کی سیاسی جماعتوں اور سیاست دانوں کے داؤں پیچ کا حصہ بن چکا ہے۔ سیاست سے وابستہ جماعتیں ایک دوسرے کو فسادات کا ذمہ دار ٹھہراتی رہی ہیں لیکن فسادات کی جانچ کرنے والے اپنی رپورٹوں میں کچھ اور ہی کہانی سناتے رہے ہیں۔ کمیٹیوں کے انکشاف کا چرچا نہیں ہوتا اور بات پھر وہیں آ کے ٹک جاتی ہے جہاں سے کمیشن بٹھانے یا انکوائری کرانے کے عمل کا آغاز ہوا تھا۔ ان سب سے الگ ایک یہ حقیقت تو اپنی جگہ ہے کہ فسادات کا اصلی چہرہ ہمارے سامنے صرف ادب کے حوالے ہی سے سامنے آتا ہے کیونکہ نہ سیاست سچ بولتی ہے نہ کمیشن اور نہ کوئی اور ایجنسی۔ سچ تو ہمیں صرف ادب میں، تخلیق میں اور ادیب کی تحریروں میں روشن دن کی طرح صاف دکھائی دیتا ہے۔ فسادات پر لکھے گئے فکشن اور شاعری کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ ادیب مجرم کو پولس یا عدلیہ کے حوالے کرنے یا اس کا ہجوم کے ہاتھوں قتل کرانے کے بجائے اسے اپنے پڑھنے والے کو سونپ دیتا ہے کہ یہی وہ لوگ ہوتے ہیں جو انسان کو زندہ رہنے کا حق دلانے کی ایک لمبی لڑائی کی صف اول میں کھڑے ملتے ہیں اور یہی لوگ ادیب کی طرح اندھیرے کے دشمن اور اجالے کے دوست ہوتے ہیں۔

مذکورہ بالا افسانوں میں فسادات کا نشانہ بننے والے افراد اور طبقوں کے دکھ درد کو تخلیقی سطح پر بڑی دردمندی سے اپنے پڑھنے والوں تک منتقل کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں لیکن ایسا نہیں ہے کہ یہ قصہ کرب و بلا انھی افسانوں میں سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اس کرب و بلا کے اور بھی کچھ واقعے جن افسانوں میں موجود ہیں ان میں ممتاز مفتی کا "ثمینہ" خدیجہ مستور کا "ٹاک نوبتے" "مینوں لے چلا بابلا" ہاجرہ مسرور کا "بڑے انسان بنے بیٹھے ہیں" یزدانی ملک کا "اور قافلہ چلا" رام لعل کا "ایک شہری پاکستانی" انور کا افسانہ "ظلمت" جوگندر پال کا "پناہ گاہ" اور فرقہ واریت کے اثرات کے تحت لکھے گئے افسانے خاص طور سے "شرطیں" (عابد سہیل) "بٹوارہ" (اصغر ندیم سید) اور "کچھوا چال" (نعیم کوثر) پڑھنے کے لائق افسانے ہیں۔

□□□

C-2, III Floor
AB Complex,179/8, Zakir Nagar
New Delhi-110025

اظہار اثر

مقبول عام ادب

ناقدین کومقبول عام ادب سے خدا واسطے کا بیر ہے جبکہ اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ آج اردو زبان مقبول عام افسانوں، فلموں اور گیتوں اور غزلوں کی وجہ سے ہی روز بروز مقبول ہوتی جارہی ہے۔ انسان جب دن بھر کی جدوجہد کے بعد تھک جاتا ہے تو اسے ذہنی تفریح اور سکون کی ضرورت ہوتی ہے جس سے اس کی ذہنی تھکن ختم ہوجاتی ہے اور یہ سکون اسے تفریحی کہانیاں یا عوامی کہانیاں پڑھنے سے ملتا تھا۔ ایک اچھی کہانی اس کے ذہن سے سارے دن کی تھکن دور کردیتی تھی اور زندگی کی نئی اُمنگ قاری کے ذہن میں بھردیتی تھی۔ ایسے ذہنی تناؤ کے عالم میں کوئی الجھانے والی کہانی یا زیادہ سنجیدہ بنادینے والی کہانی قاری کے ذہن کے لیے مزید بوجھ بن جاتی ہے اور کہانی لکھنے یا پڑھنے کا مقصد ختم ہوجاتا ہے۔

دنیا بھر میں جاسوسی کہانیوں کو ادب تسلیم کرلیا گیا ہے۔ وہ کہانی جو قاری کی سمجھ میں ہی نہ آئے وہ اس کے ذہن پر کیا تاثر چھوڑے گی۔ اس کے مقابلے میں ایک اچھی بیانیہ کہانی قاری کے ذہن پر کیا تاثر چھوڑتی ہے اس کا اندازہ ان رسالوں کی اشاعت سے لگایا جاسکتا ہے جو ان عوامی کہانیوں کی وجہ سے لاکھوں کی تعداد میں شائع اور فروخت ہوتے ہیں۔

کوئی فلمی یا عوامی ادب کا نمائندہ رسالہ ایسا نہیں ہے جس کے لیے ترقی پسند یا جدید افسانہ نگاروں نے کہانیاں نہ لکھی ہوں، خود کو عوام تک پہنچانے کے لیے ان کو بھی آخر عوامی انداز کی بیانیہ کہانیاں لکھنی پڑیں۔ ان ادیبوں کے نام گنوانے کی ضرورت نہیں، ''شمع''، ''بیسویں صدی'' اور بہت سے دوسرے مقبول رسائل میں شائع ہونے والی تحریریں اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

انگلینڈ کے ایک پروفیسر اپنی کلاس میں طالب علموں کو ادب (Literature) پڑھا رہے تھے اور بتا رہے تھے کہ اچھی کہانی کسے کہا جاتا ہے یا کیسے لکھی جاسکتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ایک اچھی کہانی لکھنے کے لیے تین اصول یا شرائط لازمی ہیں۔ اول کہانی میں اُلوہیت (Divinity) ہونی چاہیے، اس کے ساتھ محبت اور تجسس ہونا چاہیے۔ یہ تینوں چیزیں جس کہانی میں ہوں گی وہ بہترین کہانی ہوگی۔ ان کا لیکچر ختم ہونے کے آدھے گھنٹے بعد ہی ایک طالبہ نے اُٹھ کر کہا'' سر میں نے کہانی کے تینوں اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک مختصر کہانی لکھی ہے وہ سن لیجیے۔''

اجازت ملنے پر اس طالبہ نے کہانی سنائی۔

''یا خدا مجھ پر اپنا رحم کر'' محبت میں دیوانی ہوکر میں غلطی کر بیٹھی اور حاملہ ہوگئی، اب میرا کیا ہوگا؟

''بس یہ مختصر کہانی ہے سر۔ اس میں آپ کی بتائی ہوئی تینوں شرائط موجود ہیں۔'' یہ واقعہ بیان کرنے سے میرا مقصد یہ ہے کہ کہانی یا کوئی تخلیقی کام اصول وضوابط کے مدنظر نہیں کیا جاتا۔ تخلیقی قوت جو کچھ ظاہر کرنا چاہتی ہے اس کے پہلو وہ خود بناتی ہے اور اپنی فکر کے مطابق ہی اس کی تشکیل کرتی ہے۔ ہر کہانی کسی واردات، اس کے کرداروں کے اعمال اور افسانہ نگار کے اسلوب بیان سے تشکیل پاتی ہے۔ کوئی فنکار پہلے سے طے کیے گئے اصول و ضوابط کی قید میں رہ کر کہانی نہیں لکھ سکتا۔

منشی پریم چند نے ''کفن'' کسی ادبی معیار یا نقاد کو ذہن میں رکھ کر نہیں لکھی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس طرح کی کہانیاں ہمیشہ زندہ رہنے والی ہیں جو ادبی حلقوں اور عوام میں یکساں طور پر مقبول ہیں۔

گذشتہ تین دہائیوں میں جتنی بھی کہانیاں تخلیق ہوئی ہیں ان میں دو چار کہانیاں ہی ایسی ملیں گی جو عام قاری کو متاثر کرسکتی ہیں۔ آج کا نام نہاد ادب تخلیق کرنے والا فنکار منصوبہ بنا کر کہانی لکھتا ہے جبکہ تخلیقی عمل کو کسی منصوبہ بندی کی ضرورت نہیں ہوتی وہ تو صریر خامہ سے نوائے سروش کی طرح کاغذ پر اترتی چلی جاتی ہے۔ آج کے بڑے بڑے ادیب کرافٹ مین شپ پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ تخلیقی عمل کو اس خوف سے حاوی نہیں ہونے دیتے کہ کہانی میں کہیں عوامی پسند کا پہلو نہ آجائے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی کہانیوں میں ایک روکھاپن محسوس ہوتا ہے۔ زندگی میں اگر رنج و غم، جدوجہد اور مسائل ہوتے ہیں تو خوشیاں بھی ہوتی ہیں، لذتیں اور خواہشیں بھی ہوتی ہیں۔ اگر آپ زندگی کے مسائل سے بھرپور پہلو کی ہی عکاسی کرتے رہیں گے تو آپ نہ زندگی کے ساتھ انصاف کرسکیں گے اور نہ کہانی کے ساتھ۔ اگر ان پہلوؤں کو نمایاں کرنا بھی ہے تو اس انداز سے کیجیے کہ قاری کو ان سے مقابلہ کرنے کا حوصلہ ملے۔ وہ غریب شخص جو ٹھیلہ کھینچتا ہے، وہ کسان یا مزدور جو رات دن کھیت میں پھاؤڑا چلاتا ہے اور مشکل سے ایک وقت کی روٹی کھاتا ہے اس کی زندگی میں بھی کچھ لمحے ایسے ضرور آتے ہیں جب وہ مسکراتا ہے، قہقہے لگاتا ہے، زندگی کی لذتوں سے لطف اندوز ہوتا ہے، محبت بھی کرتا ہے اور نفرت بھی۔ اب اگر اس کی زندگی کے دکھ بھرے پہلوؤں کو بار بار دہرایا جاتا رہے گا تو یہ اس کی زندگی کا اصل روپ نہیں ہوگا نہ اس کے کردار کی صحیح تصویر! اس لیے اچھی کہانی لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ذہن ہر طرح کے تعصبات سے پاک

ہو تبھی تخلیقی قوت اپنے جوہر دکھاتی ہے۔ کہانیاں لکھنے والا قلم کار ہر طرح کی تبدیلیوں اور وارداتوں سے متاثر ہو کر ہی کہانی لکھتا ہے اور موضوع کیسا ہی ہو وہ اسے ''چیستاں'' نہیں بناتا بلکہ جو محسوس کرتا ہے اس کو اس انداز میں لکھ دیتا ہے جس میں قاری کی دلچسپی بھی قائم رہے اور قاری کہانی کے نقطۂ عروج میں فنکار کے اس پیغام کو بھی سمجھ لے جو وہ کہانی کے ذریعے دینا چاہتا ہے۔

مقبول عام ادب میں تین موضوعات پر زیادہ کہانیاں لکھی جاتی ہیں۔ اول رومانی کہانیاں جو انسانی زندگی کا سب سے اہم حصہ ہوتی ہیں، دوم پراسرار اور جاسوسی کہانیاں۔ ابن صفی کا نام جاسوسی ناول نگاروں میں اول نمبر پر آتا ہے جنھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے بہت سے لوگوں کو اردو پڑھنے پر مجبور کیا۔ تیسرے نمبر پر مافوق الفطرت کہانیاں آتی ہیں جن میں پراسرار فضا پیدا کر کے قاری کی دلچسپی بڑھائی جاتی ہے۔ جنوں اور پریوں کی کہانیاں، بھوتوں کے قصے جو ہماری داستانوں اور حکایات کا بھی حصہ رہے ہیں، نئے اسلوب میں لکھے جاتے رہے ہیں۔ بیسویں صدی کے ابتدائی دور میں حجاب امتیاز علی اور مسز عبدالقادر اسی طرح کی پراسرار کہانیاں لکھنے کے لیے مشہور تھیں۔ راقم الحروف نے بھی جاسوسی ناولوں کے ساتھ کئی پراسرار ناول لکھے ہیں جو بے حد مقبول ہوئے ہیں۔ پاکستان میں اردو کے تمام ڈائجسٹ جاسوسی اور مافوق الفطرت کرداروں کی کہانیوں کے بل بوتے ہی بکتے ہیں۔ ہندوستان میں شائع ہونے والے زیادہ تر ڈائجسٹ پاکستانی ڈائجسٹوں کی کہانیاں شائع کرتے ہیں۔ اس طرح ان کو کہانی کے معاوضے کے ساتھ کتابت کے خرچ سے بھی نجات مل جاتی ہے۔

اندھا قانون، مافیا کے جرائم، نفرت، انتقام اور مذہبی جنون سے متعلق کہانیاں بھی مقبول عام ادب کا حصہ ہیں جنھیں قاری شوق سے پڑھتے ہیں۔ جو عوامی ادیب ان موضوعات کو سلیقے سے برتتے ہیں ان کی تحریریں یقینی طور پر قاری کے اندر برائی کے خلاف ایک جذبہ پیدا کرتی ہیں۔ اس خوبی کے باوجود عوامی کہانیوں کو ادبی کہانیاں کہنے سے احتراز کرنا یقیناً عوامی ادب اور ادیبوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ کہانی کا موضوع اور اسلوب بیان کسی کہانی کو اس کی شناخت دیتے ہیں۔ اس لیے کہانی کو اچھے یا برے درجوں میں تو تقسیم کیا جا سکتا ہے لیکن اس کو ادبی یا غیر ادبی خانوں میں نہیں رکھا جا سکتا۔

عوامی ادب میں جنسی کہانیاں بھی خاصی تعداد میں شائع ہوتی ہیں لیکن اس کا قصور وار ادیب کو نہیں ٹھہرایا جا سکتا کیونکہ یہ تو معاشرے کی دین ہے۔ ادیب تو وہی لکھتا ہے، جو دیکھتا ہے، سنتا ہے اور پڑھتا ہے یا جو اس کا معاشرہ اس کو سکھاتا ہے۔ آج کے دور میں الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے جن اقدار کو نمایاں کیا جا رہا ہے، ادیب کا اس سے متاثر ہونا فطری بات ہے۔

لیڈی چیٹرلیز لور (Lady Chaterly's Lover) اور بالزاک کی کہانیاں جنسی ہونے کے باوجود بہت مقبول تھیں۔ اس زمانے میں فرانس کا معاشرہ ہی اس طرح کا تھا اس لیے ایسی کہانیوں کو شوق سے پڑھا جاتا تھا۔ لیڈی چیٹرلیز لور پر تو فحش نگاری کے الزام میں پابندی عاید کر دی گئی تھی لیکن بعد میں وہ پابندی بھی ہٹالی گئی تھی۔

دراصل جنسی کہانی اور فحش نگاری میں بہت فرق ہے۔ بہت سے ادیب فحش نگاری اور جنسی کہانی کے درمیان حد فاصل قائم نہیں کر پاتے اور آج کل تو امریکہ کے تمام مشہور ناول نگار صرف اس لیے لاکھوں کی تعداد میں بک رہے ہیں جن کے ناول واقعی بلو فلموں کی طرح فحش ہوتے ہیں۔ امریکی عوام ان ادیبوں کی تحریروں کے دیوانے ہیں لیکن جن ادیبوں میں تخلیقی صلاحیت ہوتی ہے وہ جنسی موضوعات کو بھی اس طرح برتتے ہیں کہ اس سے کہانی کا بنیادی نظریہ مجروح نہیں ہوتا۔

آج کل یہ روش بھی عام ہوتی جا رہی ہے کہ بہت سی خواتین افسانہ نگار جنسی معاملات کو وضاحت سے بیان کرنا عیب نہیں سمجھتیں چونکہ ایسی کہانیاں لکھنے والی خواتین ہوتی ہیں اس لیے وہ بہت جلد ادبی دنیا میں اپنا مقام بنا لیتی ہیں۔ واجدہ تبسم اس کی پہلی مثال ہیں۔ ان کے بعد بہت سی خواتین ہیں جن کا اس ضمن میں نام لیا جا سکتا ہے۔

''خاتون مشرق'' ایک زمانے میں ایک لاکھ تک چھپتا رہا ہے۔ دہلی سے یوں تو بہت سے مقبول عام رسالے شائع ہوتے تھے اور کافی بڑی تعداد میں فروخت ہوتے تھے۔ ان رسالوں میں ماہنامہ ''کہکشاں''، ''جمالستان''، ''شمع''، ''آریہ ورت''، ''نرالی دنیا''، ''مست قلندر'' کے نام بہت مشہور تھے۔ اسی زمانے میں ''بانو'' اور ''خاتون مشرق'' بھی شائع ہوتے تھے۔ یہ دونوں رسالے خواتین کے رسالے کہلاتے تھے اور 1950 تک ان کے پانچ ہزار خریدار ہوا کرتے تھے، ایجنٹوں کو بہت کم بھیجے جاتے تھے۔ ان رسالوں میں صرف اصلاحی کہانیاں شائع ہوتی تھیں جو خاص طور پر عورتوں کے مسائل کا احاطہ کرتی تھیں۔ ان رسالوں کا کمزور پہلو یہ تھا کہ یہ کسی خاتون کے تحریر کردہ افسانے کو واپس نہیں کرتے تھے بلکہ ایڈیٹر ان افسانوں کو کاٹ چھانٹ کر کے قابل اشاعت بنا دیتے تھے۔ اس طرح یہ رسالے خواتین میں مقبول ہوتے چلے گئے۔

''آریہ ورت'' اس دور کا بے حد مقبول رسالہ تھا۔ اس زمانے میں ''شمع'' اکیس ہزار چھپتا تھا اور ''آریہ ورت'' اٹھارہ ہزار۔ ایسے ہی ایک عوامی رسالے ''نرالی دنیا'' کی ادارت فکر تونسوی سنبھالے ہوئے تھے اور ان رسالوں میں ہر قسم کے ادیبوں کی تخلیقات شائع ہوتی تھیں۔ کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جاتی تھی۔

□□□

Y-5, New Ranjeet Nagar
New Delhi-110008

ہماری مطبوعات سے

حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری

"بحر الفصاحت" سے ماخوذ

شعر کی تعریف میں

شعر کے معنی لغت میں جاننے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کلام موزوں کا نام ہے جو اوزانِ مقررہ میں سے کسی وزن پر ہو اور مقفّیٰ ہو اور بالقصد موزوں کیا گیا ہو۔ پس یہاں سے معلوم ہوا کہ اگر ایک کلمہ کسی رکن کے وزن پر ہو یا کلام ہو مگر موزوں نہ ہو یا کلام موزوں ہو مگر مقفّیٰ نہ ہو یا کلام موزوں بالقصد نہ موزوں کیا گیا ہو وہ اصطلاح کے موافق شعر نہیں ہے۔ اور شاعر کے لغوی معنی جاننے والے کے ہیں اور اصطلاح میں اس شخص کو کہتے ہیں جو برائی بھلائی، بحر و وزن و تقطیع و قافیہ وغیرہ و لوازمِ شعر کو جانتا ہو۔ پس جو شخص ان لوازمِ شعری سے خبردار نہ ہوگا گو طبع موزوں رکھتا ہو اس کو شاعر نہ کہنا چاہیے۔ حالی اپنی کلیات کے مقدمے میں لکھتے ہیں کہ شعر کے لیے وزن ایک ایسی چیز ہے جیسے راگ کے لیے بول۔ جس طرح راگ فی حد ذاتہ الفاظ کا محتاج نہیں اسی طرح نفسِ شعر، وزن کا محتاج نہیں البتہ وزن کی شرط نظم کے لیے ہے۔ قدیم عرب کے لوگ یقیناً شعر کے یہی معنی سمجھتے تھے۔ جو شخص معمولی آدمیوں سے بڑھ کر کوئی مؤثر اور دلکش تقریر کرتا تھا اسی کو شاعر جانتے تھے۔ جاہلیت کی قدیم شاعری میں زیادہ تر اسی قسم کے برجستہ اور دلاویز فقرے اور مثالیں پائی جاتی ہیں جو عرب کی عام بول چال سے فوقیت اور امتیاز رکھتی تھیں۔ یہی سبب تھا کہ جب قریش نے قرآن مجید کی نرالی اور عجیب عبارت سنی تو جنھوں نے اس کو کلام الٰہی نہ مانا وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو شاعر کہنے لگے حالانکہ قرآن شریف میں وزن کا مطلق التزام نہ تھا۔ محقق طوسی اساس الاقتباس میں لکھتے ہیں کہ عبری اور سریانی اور قدیم فارسی میں شعر کے لیے وزنِ حقیقی ضرور نہ تھا۔ سب سے پہلے وزن کا التزام عرب نے کیا ہے۔ قافیہ بھی ہمارے ہاں شعر کے لیے ایسا ہی ضروری سمجھا گیا ہے جیسے کہ وزن، مگر درحقیقت وہ بھی نظم ہی کے لیے ضروری ہے نہ شعر کے لیے۔ اساس میں لکھا ہے کہ یونانیوں کے یہاں قافیہ بھی مثل وزن کے ضروری نہ تھا۔ الغرض وزن اور قافیہ جن پر ہماری موجودہ شاعری کا دارومدار ہے اور جن کے سوا اس میں کوئی خصوصیت ایسی نہیں پائی جاتی جس کے سبب سے شعر کا شعر پر اطلاق کیا جا سکے۔ یہ دونوں شعر کی ماہیت سے خارج ہیں۔ اسی لیے زمانۂ حال کے محقق شعر کا مقابل جیسا کہ عموماً خیال کیا جاتا ہے نثر کو نہیں ٹھہراتے بلکہ علم و حکمت کو ٹھہراتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح حکمت کا کام براہِ راست یہ ہے کہ ہدایت کرے، تحقیقات میں مدد پہنچائے اور روشن کرے عام اس سے کہ کوئی اس سے محظوظ یا متعجب یا متاثر ہو یا نہ ہو، اسی طرح شعر کا کام براہ راست یہ ہے کہ فی الفور لذت یا تعجب یا اثر پیدا کردے عام اس سے کہ حکمت کا کوئی مقصد اس سے حاصل ہو یا نہ ہو اور عام اس سے کہ نظم میں ہو یا نثر میں۔ حالی نے یہاں انتہا درجے کی غلطی کی ہے اور اپنے معتقدوں کو غلطی میں ڈالنے کا کام کیا ہے۔ اس لیے کہ جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ شعر کے لیے وزن شرط نہیں وہ اہلِ منطق ہیں اور اساس الاقتباس کا جو حوالہ دیا ہے وہ بھی فنِ منطق ہی میں ہے۔ منطقیین کی اصطلاح میں شعر اور چیز ہے اور شعرا کے نزدیک شعر اور چیز ہے۔ پس حالی نے ناسمجھی سے منطقیین کی تعریف کو شاعروں کی تعریف کی بحث میں داخل کر دیا ہے۔ محقق طوسی نے اساس الاقتباس میں بطور منطقیوں کے شعر کی تعریف کی ہے کیونکہ یہ کتاب ہی منطق میں لکھی ہے اور معیار الاشعار میں شعر کی تعریف اسی طرح کی ہے جو عرف جمہور میں مشہور ہے اور وہ یہ ہے کہ شعر کلام موزوں مقفّیٰ کا نام ہے کیونکہ کتاب فنِ عروض میں لکھی ہے۔ پس منطقیوں کے نزدیک وزن شعر کی ماہیت میں معتبر نہیں۔ ان کے نزدیک جو کلام قضایائے تخییلیہ سے بنے وہ شعر ہے، وزن کا ہونا اس میں ضرور نہیں۔ چنانچہ شیخ بوعلی سینا کتاب شفا کی بحث منطق میں فرماتا ہے **لانظر للمنطقی فی شیء من ذلک الافی کونہ کلاماً محیلا** یعنی منطقی کی نظر وزن اور قافیے کی طرف نہیں اس کے نزدیک تو یہ چاہیے کہ وہ کلام مخیل ہو اور دوسری جگہ کہتا ہے **انما ینظر المنطقی فی الشعر من حیث ھو مخیل** یعنی وہ شعر میں اس حیثیت سے فکر و غور کرتا ہے کہ وہ کلام مخیل ہے۔ اور امام رازی نے شرح عیون الحکمۃ میں فرمایا ہے **ان نظر فیہ من حیث انہ یفید تخیلا فانما مقام التصدیق و الترغیب فذلک ھو المنطق.** بلکہ محقق طوسی نے خود اساس میں دونوں اصطلاحوں کے فرقوں کو کھول دیا ہے اس طرح کہ شعر در عرفِ منطق

"بحر الفصاحت" نظم و نثر کے محاسن اور عیوب پر ایک اہم کتاب ہے جو استناد کا درجہ رکھتی ہے۔ دو جلدوں پر مشتمل حکیم نجم الغنی خاں نجمی رام پوری کی اس ضخیم کتاب کی تدوین ممتاز محقق ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے کی ہے۔ قومی اردو کونسل کی شائع کردہ 1621 صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/730 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45 فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

کلامِ مخیل ست و در عرفِ متاخران کلامِ موزون مقفی اور دوسری جگہ لایا ہے مادہ شعر سخن ست و صورتش نزدیک متاخران وزن و قافیہ و نزدیک منطقیان تخییل اور پھر کھول کر اساس میں یوں کہا ہے نظرِ منطقی خاص ست بہ تخییل و وزن راز ان جہت اعتبار کنند کہ بہ وجہی اقتضای تخییل کند و صناعت منطق باحثِ بالذات از تخییل شعر ست و بالعرض از دیگر احوال۔ یہ تو شعرِ منطقی کی نسبت تھا دیکھو شعرِ متعارف کی نسبت اساس میں کیا کہا ہے بہ حسب این عرف ہر سخن را کہ وزنی و قافیتی داشتہ باشد خواہ آن سخن برہانی باشد خواہ خطابی خواہ صادق خواہ کاذب واگر ہمہ توحید خالص یا ہذیانیات محض باشد آن را شعر خوانند واگر ز وزن و قافیہ خالی باشد اگرچہ مخیل بود آن را شعر نخوانند۔ اور مخیلات وہ باتیں ہیں کہ جب نفس کو پہنچتی ہیں تو وہ ان کی تاثیر سے کسی چیز کی طرف راغب ہو جاتا ہے یا اس سے نفرت کرنے لگتا ہے بغیر غدر و فکر کے کیونکہ نفس رغبت یا دہشت سے منفعل ہو جاتا ہے اور تخییل کا اثر بہ مقابلے تصدیق کے نفس پر جلد پڑتا ہے، کیونکہ اس میں تعجب صدق سے زیادہ ہوتا ہے کیونکہ یہ لذیذ ہے۔ اور مخیلات کئی طرح کے ہوتے ہیں کبھی سچے ہوتے ہیں کبھی جھوٹے ہوتے ہیں کبھی مستحیل ہوتے ہیں کبھی ممکن ہوتے ہیں اور نفس میں ان کے اثر سے یا انبساط پیدا ہو جاتا ہے یا انقباض اور اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مخیلات کی تاثیر تصدیق سے زیادہ ہوتی ہے اگرچہ اس کے ساتھ تصدیق نہیں ہوتی اور منطقین نے شعر کے لیے یہ بات شرط کی ہے کہ کلام قانون لغت کے مطابق ہو اور اس میں ایسے اعلیٰ درجے کے استعارے اور عمدہ تشبیہیں ہوں کہ نفس میں ان کی وجہ سے تاثیر عجیب اور انفعال غریب پیدا ہو کر فرحت یا رنج و غم آ جائے۔ اسی لیے قضایای شعریہ میں اولیاتِ صادقہ کا استعمال جائز نہیں، اور اولیاتِ صادقہ سے مراد ایسے قضایا ہیں کہ عقل ان قضایا کا تصور کرتے ہی ان کے قطعی ہونے کا حکم لگا دیتی ہے، کسی دوسری چیز کی طرف محتاج نہیں ہوتی، جیسے کُل بڑا ہے جز سے بلکہ شعر میں مخیلاتِ کاذبہ کا استعمال مستحسن ہے۔ جس شعر میں مخیلات صادقہ کا استعمال ہوتا ہے وہ بے مزہ ہوتا ہے جیسے ناسخ کی نظم سراج کے یہ شعر:

کی خدا نے جو یہ زبان عطا
ہے بلا شک عطیۂ عظمیٰ
اس سے ہے مختلف مزوں کی تمیز
اس سے پاتے ہیں لذتِ ہر چیز
کوئی کڑوی ہے کوئی ہے میٹھی
نمکین کوئی، کوئی کھٹ مٹھی
کوئی اچھی ہے کوئی زشت و زبوں
مزے سب چیزوں کے ہیں گوناگوں
سب مزوں سے زبان واقف ہے
ان ہی اسرار کی یہ کاشف ہے
جو نہ ہو یہ تو کچھ نہ ہو معلوم
نہ ہو کوئی مزہ کبھی مفہوم
اور بھی ہوتے ہیں زباں سے کام
ہے ممد وقت بلع آب و طعام
اس سے احکام بہرہ منداں ہے
قوتِ تام بہرہ منداں ہے

ولہ

نفع کیا کیا ہوا کو بخشا ہے
صحتِ جسم اس سے پیدا ہے
بعض اوقات اگر ہوا نہ چلے
کبھی دن رات اگر ہوا نہ چلے
دم رکیں، آدمی پڑیں بیمار
میوے فاسد ہوں سوکھیں پھل اک بار
آوے طاعون یا وبا آوے
غلے پر آفت و بلا آوے
اس سے ہے زندگانی ابداں
اس سے ہے نفع صحت انساں
ناک سے جوفِ تن میں جاتی ہے
زندگی اس سبب سے آتی ہے
خارج تن میں لگتی ہے اگر
حق میں ابدان کے ہے مصلحِ تر

اسی طرح یہ شعر مولوی محمد حسین آزاد کے:

اے آفتاب صبح سے نکلا ہوا ہے تو
عالم کے کاروبار میں دن بھر پھرا ہے تو
ہیں روز و شب زمانے کے پیہم قدم ترے
پیمانے محنتوں کے یہ ہیں بیش و کم ترے
دامان کو ہسار میں اب جا کے سو رہو
دن بھر کا کام شام کو سمجھا کے سو رہو
اے دوست تیرا حکم تھا جاری جہان میں
اور روشنی تھی عام زمین آسمان میں
دن ہے خدا نے ہم کو دیا کام کے لیے
اور رات کو بنایا ہے آرام کے لیے

لیکن یہ قاعدہ اکثری ہے نہ کلی اس لیے کہ بعض نظم باوجود صدق مقدمات کے عمدہ استعاروں اور برجستہ تشبیہوں کی وجہ سے نفس میں تاثیر اور لذت پیدا کرنے میں مخیلات کا ذبہ سے کم نہیں ہوتی، جیسے متاخرین میں سے درد تخلص ایک شاعر سیرِ کوہساری کی کیفیت لکھتا ہے:

درحقیقت ہے عجب پر لطف سیرِ کوہسار
جس کے ہر نظارے پر صد ذوقِ جنت ہے نثار
ایستادہ ہیں کروڑوں اک طرف ساکھو کے پیڑ
گر رہے ہیں دوسری جانب ہزاروں آبشار
دیکھتا کیا ہوں کہ صدہا چشمہ ہای کوثری
سنگلاخوں پر ہیں کرتے اپنی ہستی کو نثار
اک طرف سر آسماں جاہی ہیں صدہا چوٹیاں
دوسری جانب نظر آتے ہیں دہشت ناک غار
رستمِ دوراں بھی ان غاروں کو گر دیکھے کبھی
کیا عجب ہے خوف سے آ جائے اس کو بھی بخار
باوجود اس کے ہے ان میں کچھ عجب دل بستگی
یعنی اٹھتی ہیں اسی جانب یہ نظریں بار بار
تحتِ کوہی کی طرف دیکھو کہ کس انداز سے
باغباں قدرت کا دکھلاتا ہے پھولوں کی بہار
نرم نازک ڈالیوں پر ان سے بھی نازک ہیں برگ
اور ان پتوں کی نوکیں کس طرح ہیں قطرہ بار
کس قدر دل چسپ تھا نظارہ ہنگامِ سفر
اونچی اونچی چوٹیوں پر لہلہاتے مرغزار
ایک جانب اُٹھ رہا ہے قلہ ہائے کوہ سے
کس قدر آہستہ آہستہ یہ نورانی غبار
رفتہ رفتہ چھا گیا اطرافِ وادی میں دھواں
اور پھر پڑنے لگی چاروں طرف ہلکی پھوار
اس کو میں ناحق دھواں کہتا ہوں یہ تو اصل میں
کوثرِ مواج ہے یا جوئے شیریں کی ہے دھار
یا کہ ابنائے زمانہ کی زبونی دیکھ کر
قلب سے اشجارِ صحرا کے یہ نکلا ہے بخار
یا کہ آہیں مجتمع فرقت کے ماروں کی ہیں یہ
جا رہی ہیں بہرِ عرضِ حال سوئے کردگار
یا نظر بازوں کی نظروں سے بچانے کے لیے
حسن کوہی پر یہ پردہ کھنچ رہا ہے بار بار
الغرض جو کچھ بھی ہو یہ ہے بہت دل چسپ چیز
دیکھنا اب رفتہ رفتہ ہو رہا ہے کم غبار
جس قدر کم ہوتا جاتا ہے یہ نورانی دھواں
بس اسی نسبت سے ظاہر ہو رہے ہیں سب اُبھار
جس طرح تصویر خانے میں مصور کی پلیٹ
اپنی جزئیات کا کرتی ہے تدریجی اُبھار
بس اسی صورت سے جتنا ابر ہے کم ہو رہا
آ رہے ہیں پھر مرے پیشِ نظر کوہی سنگار

بہر صورت جمہور کے نزدیک شعر میں وزن اور قافیہ دونوں معتبر ہیں۔ صرف تخیل ہی کافی نہیں۔ پس جو سخن وزنِ حقیقی اور قافیہ رکھتا ہو خواہ اس کی ترکیب برہانیات سے ہو یا جدلیات سے یا خطابیات سے یا مغالطات یا مخیلات سے یا ہذیانیات سے وغیرہ وغیرہ وہ شعر ہے اور تخیل ذات شعر میں معتبر نہیں اسی لیے شعر کی تعریف کلام موزوں مقفیٰ کے ساتھ کرتے ہیں نہ کلامِ مخیل موزوں مقفیٰ کے ساتھ۔ اور وزن (واو کے فتحہ زائے ہوز کے سکون سے) مراد ہے اس ہیئت سے جو نظامِ ترتیب حرکات وسکنات اور ترتیب حروف اور تناسب عدد حروف اور مقدار کے تابع ہو، ایسے نہج پر کہ نفس اس سے ایک خاص قسم کی لذت کا ادراک کرے۔ اس ادراک کو ذوق کہتے ہیں۔ میزان الوافی میں محمد سلیم بن عظیم جعفری نے کہا ہے کہ بعض کے نزدیک وزن ہیئتِ ذوقی کا نام ہے جو ذہنِ مستقیم میں حاصل ہوتی ہے ترتیب ارکانِ موضوعہ سے۔ اور نتیجہ دونوں تعریفوں کا ایک ہے۔ تناسب عدد سے مراد یہ ہے کہ ارکان مصرعوں کے مساوی ہوں۔ پس چار رکن والا مصرع تین رکن والے مصرع کے ساتھ موزوں نہ سمجھا جائے گا۔ اور مقدار کے تناسب سے یہ مراد ہے کہ ارکان باہم مقدارِ حروف میں متناسب ومتقارب ہوں۔ پس جو مصرع تین مفعولن پر مشتمل ہو وہ اس مصرع کا جو تین مستفعلن پر مشتمل ہو متحد الوزن نہ ہوگا لیکن سالم اپنے مزاحف کے ساتھ جیسے فعولن اور فعولان۔ اسی طرح ایک مزاحف دوسرے مزاحف کے ساتھ مثلاً فعول اور فعل تناسب معتبر سے خالی نہیں اور چونکہ طبیعتیں مختلف ہوتی ہیں اس لیے اوزانِ شعر بھی قوموں میں مختلف طور پر ہوتے ہیں اور ہر موزوں کسی وجہ سے مخیل ہوتا ہے اور اک طرح کی تاثیر پیدا کرتا ہے، مگر یہ ضرور نہیں کہ کلامِ مخیل وزن شعر رکھتا ہو بہت سی نثر کی عبارتیں تخیل کا فائدہ بخشتی ہیں اور چونکہ وزن سے کلام کی خوبی دوبالا ہو جاتی ہے اسی لیے کہا ہے کہ وزن دار کلام سلاست میں پانی کی طرح ہے اور لطافت میں ہوا کی مثل ہے اور انتظام میں موتیوں سے مشابہت رکھتا ہے۔ عرب کی قدیم شاعری میں جو زیادہ تر برجستہ فقرے اور مثالیں پائی جاتی ہیں تو اس سے شاعروں کی طبیعت کی خوبی ثابت ہوتی ہے اور یہ بات ثابت نہیں ہو سکتی کہ شعر کے لیے وزن ضروری نہیں، اور عرب جو قرآن کی فصاحت و بلاغت کو دیکھ کر پیغمبر خدا کو شاعر کہنے لگے تھے تو

اس سے بھی یہ امر ثبوت کو نہیں پہنچ سکتا کہ شعر کے لیے وزن شرط نہیں، بلکہ وجہ اس کی یہ تھی کہ وہ یہ جانتے تھے کہ فصیح و بلیغ کلام نظم ہو یا نثر شاعر ہی ادا کر سکتا ہے۔ نظم اور شعر میں وزن اور عدم وزن کے اعتبار سے کوئی فرق نہیں، دونوں میں وزن معتبر ہے۔ شعرا کی اصطلاح میں نظم الفاظ کی ایسی ترکیب کو کہتے ہیں کہ ان کے معانی میں بھی ترتیب ہو اور ان کی دلالت کا بندوبست مقتضائے عقل کے موافق ہو اور یہ بات نہ ہو کہ لفظوں کو آگے پیچھے بول دیا جائے اور جس طرح اتفاق پڑے بغیر لحاظ ترتیب اور دلالت کے ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے ملا دیا جائے۔ پس یہ نظم ہے:

یہ چوٹی زر افشاں ماتھ سبز اُس پر دوشالہ ہے
تماشا ہے پر طاؤس نے کالے کو پالا ہے

اور جب اس کو یوں کہیں:

یہ افشاں زر سبز ماتھ دوشالہ چوٹی ہے اُس پر
پر ہے تماشا کو کالے طاؤس پالا ہے

تو یہ لفظ ہوگا نہ نظم۔ اور حالی کا یہ کہنا کہ حال کے محقق شعر کا مقابل نثر کو نہیں ٹھہراتے بلکہ علم و حکمت کو ٹھہراتے ہیں، یہ بھی درست نہیں۔ اسلامی دنیا کے تمام انشا پرداز اور سخنور بالاتفاق شعر کا مقابل نثر کو ٹھہراتے ہیں۔ عروضیوں کا یہی مذہب ہے اور جو لوگ شعر کا مقابل علم و حکمت کو ٹھہراتے ہیں وہ اہل فلسفہ ہیں۔ ان کے نزدیک شعر غیر یقینیات میں سے ہے اس لیے وہ علم و حکمت یعنی یقینیات کا مقابل ہے۔ پس ہر اک علم کی علیحدہ اصطلاح ہے اور یہ کہنا کہ شعر کے لیے وزن حقیقی ضروری نہ تھا سب سے پہلے وزن کا التزام عرب نے کیا ہے بالکل تحقیق کے خلاف ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہر زبان کے شعر کے لیے وزن ضروری ہے۔ البتہ موجودہ قواعد وزن کو عورتوں نے ایجاد کیا ہے ورنہ فن عروض کی ایجاد کے پہلے سے بھی شعر وزن دار ہوتے تھے اور ان کے وزن کا معیار وجدان سلیم اور ذوق طبع مستقیم تھا۔ ان ہی اشعار کو جانچ کر وزن کے قواعد مقرر ہوئے ہیں۔ اور محقق طوسی نے اساس میں یہ جو کہا ہے کہ قدما کلام مخیل کو شعر کہتے تھے اگر چہ وہ وزن حقیقی نہ رکھتے ہوتے اور یونانیوں کے بعض اشعار اس طرح کے تھے۔ اور دوسری پرانی زبانوں جیسے عربی، سریانی، فارسی میں بھی اس کا اعتبار نہ تھا۔ عرب نے اول وزن حقیقی کو شعر میں اعتبار کیا ہے مثل قافیہ کے اور پھر دوسری قوموں نے ان کی متابعت کی۔ یہ قول بھی حالی صاحب کے مفید نہیں اس لیے کہ ہم یہ کہیں گے کہ قوموں نے جس شعر میں وزن کا اعتبار نہ کیا تھا وہ ہے جو یقینیات کے مقابل ہے اور قدما سے مراد محقق طوسی کی حکما و فلاسفہ ہیں نہ کہ شعرا کیونکہ شعرا و اہل عروض کو انھوں نے متاخرین کے لفظ سے تعبیر کیا ہے، علاوہ اس کے ان زبانوں میں علمانے علم عروض کے قواعد بھی منضبط نہ کیے تھے۔ اس لیے سوائے ذوق طبع سلیم کے وزن شعر کے جانچنے کا کوئی معیار نہ تھا۔ یہی حال شعرائے عرب کا بھی تھا کہ وہ ذوق طبیعت سلیم کے اقتضا سے شعر تو کسی وزن عروضی پر کہتے تھے مگر ان کے ہاتھ میں اس کے جانچنے کے لیے کوئی میزان نہ تھی، اسی وجہ سے کبھی ایک وزن سے دوسرے وزن قریب پر انتقال کر جاتے تھے اور غلطیاں کھا جاتے تھے۔ قواعد عروض ان کے اشعار کے مطابق بنائے گئے ہیں نہ یہ کہ قواعد عروض کو پیش نظر رکھ کر شعر کہے جاتے تھے۔ جس کو جمہور کی اصطلاح میں شعر کہتے ہیں ایسا شعر ہر زبان میں وزن دار ہی ہوتا رہا ہے۔ اگر کوئی جاہل اپنا دل خوش کرنے کو چند الفاظ بے وزن جوڑ کر ان کو شعر سمجھتا تو ایسا کلام اہل علم کے نزدیک سلف سے خلف تک کسی زبان میں شعر نہیں مانا جاتا اور یہ قول بھی صحت سے عاری ہے کہ عرب نے اوّل وزن حقیقی کو شعر میں اعتبار کیا اس لیے کہ ہندوؤں کے یہاں ہزاروں برس سے شعر میں وزن حقیقی کا اعتبار چلا آتا ہے۔ پس جس کلام میں وزن حقیقی موجود ہو وہ شعر ہے اور جس میں نہ ہو وہ نثر ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ قافیہ مطلق شعر کے واسطے ضرور ہے جیسے قصیدہ اور قطعہ اور رباعی وغیرہ اور اس تقریر پر ذاتیات شعر سے نہ ہوگا بلکہ اس کے عوارض سے ہوگا اور محققین کا گروہ اعظم قافیہ کا اعتبار ذات شعر میں واجب سمجھتا ہے۔ چنانچہ بوعلی سینا بھی شفا میں کہتا ہے **لا یکاد ان یسمی عندنا الشعر مالیس بمقفی** جو مقفی نہیں وہ ہمارے نزدیک شعر نہیں۔ یاد رکھو کہ کلام ان دو کلموں کو کہتے ہیں جو باہم ایسی اسناد رکھتے ہوں کہ اگر اس کا کہنے والا چپ رہے تو سامع کو فائدہ حاصل ہو جائے اور کچھ انتظار نہ رہے۔ پس شعر میں کلام کی قید سے سخن بے معنی بھی نکل گیا اور شعر کی تعریف اس پر صادق نہ آئی اس لیے کہ اس سے سامع کو کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوتا لیکن مجازاً اس کو بھی شعر کہتے ہیں جیسے کہیں یہ شعر مہمل و بے معنی ہیں مثال اس کی یہ شعر راشد علی ضیا بدایونی شاگرد منشی اسماعیل حسین منیر کا:

ملحوظ موقع طلب مدعا رہے چشم حباب بحر میں سُرمہ لگا رہے

ایسے ہی یہ شعر شاگرد تخلص بدایونی کا:

تم چشم حنائی میں لگاؤ گے جو مسی
ہر ہیضہ اشتر میں نکل آئیں گے چھالے

بدبدالشعر

مرکزِ محورِ گردوں بہ لب آب نہیں ناخنِ قوسِ قزح شبہٴ مضراب نہیں

آب حیات میں لکھا ہے کہ جب شیخ ناسخ کے پاس کوئی ناواقف شخص شائق کلام آتا تو چند بے معنی غزلیں بنا رکھی تھیں ان میں سے کوئی شعر پڑھتے یا اسی وقت چند بے ربط الفاظ جوڑ کر موزوں کر لیتے اور سناتے اگر وہ سوچ میں پڑ جاتا اور چپ رہ جاتا تو سمجھتے تھے کہ کچھ سمجھتا ہے، اسے اور سناتے تھے اور اگر اس نے بے تحاشا تعریف کرنی شروع کر دی تو اسی طرح کے ایک دو شعر پڑھ کر چپکے ہو رہتے تھے۔

□□□

کے. ایم. اشرف

ہماری مطبوعات سے

''انقلاب اٹھارہ سو ستاون'' سے ماخوذ

1857 کی بغاوت میں وہابیوں کا حصہ

بعض ہندوستانی عالموں کی رائے ہے کہ 1857 کی بغاوت غیر مطمئن فوج کے ایک حصے کی غیر مربوط اور بے ساختہ شورش سے زیادہ حیثیت نہ رکھتی تھی اور کسی بھی اعتبار سے اسے جنگ آزادی یا قومی بغاوت کا نام نہیں دینا چاہیے۔ بعض باخبر برطانوی شاہدین جنھوں نے موقعہ پر اس مسئلہ کی تحقیق کی، مذکورہ بالا نظریے کی تائید نہیں کرتے۔ مثال کے طور پر الیگزینڈر رڈف ''بغاوت ہند'' پر جن کے مراسلات کا سلسلہ بغاوت کے فوراً بعد ہی شائع ہوا، یہ کہتے ہیں کہ ''غدر اور بغاوت کو سیاسی سازش کا نتیجہ سمجھنے اور قرار دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔'' وہ اسے محض ایک فوجی شورش خیال نہیں کرتے بلکہ ایک بغاوت، ایک انقلاب سمجھتے ہیں جس میں فوجی سپاہیوں کے علاوہ عوام نے انگریزی اقتدار اور برتری کے خلاف شرکت کی۔ اسی طرح مالیسن کا 1857 سے متعلق مقالہ مشہور ہے۔ بعد میں جب ہندوستانی اس کے ساتھ کھل کر بات کرنے لگے تو اس نے ازسرنو چھان بین کی۔ اُسے اس بات کا یقین ہوگیا کہ کچھ ''ایسے خارجی اسباب کام کر رہے تھے جن سے ہندوستانیوں کے دلوں میں کینہ بڑھ گیا اور یہ جذبۂ نفرت شخصی نہیں بلکہ قومی تھا۔

اگر ہم سلطان ٹیپو کے عہد سے واقعات کا تسلسل دیکھیں تو ہم یقیناً اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ انیسویں صدی کے نصف اول کے دوران ہندوستانی بحیثیت مجموعی برطانوی حکمرانوں سے مقابلہ کرنے ہندوستان کو آمادۂ پیکار کرنے کی کوشش کی اور پھر غدر ویلور (1806) جو چھوٹے پیمانے پر 1857 کے انقلاب کا ہی نمونہ تھا۔ البتہ یہ قابلِ ذکر ہے کہ نئے زمینداروں کا طبقہ اور بڑے شہروں میں رہنے والے انگریزیت کے دلدادہ روشن خیال لوگ اس ہنگامے میں شریک نہ ہوئے کیوں کہ ان کی تازہ حاصل کردہ دولت اور سماج میں حیثیت انگریزوں ہی کی وجہ سے تھی اور وہ محسوس کرتے تھے کہ ان کی قسمت انگریزوں کے ساتھ وابستہ ہے۔

اس طویل تیاری کی وجہ سے ہندوستان کی جنگ آزادی کے سپاہیوں نے 1857 تک ملکی اور عالمی صورت حال نے اچھی خاصی واقفیت حاصل کر لی تھی اور ہندوستانی فوج میں ایک پائیدار محاذ قائم کر لیا تھا۔ مثال کے طور پر اٹھارھویں صدی کے ختم کے قریب میسور کے سلطان ٹیپو اور اودھ کے نواب وزیر علی دونوں نے ملک کے اندر اور بیرونی ممالک میں انگریزوں کی مخالف قوتوں کی حمایت حاصل کرنے کی کوشش کی تھی 1857 میں ایسی سیاسی چالیں منظر عام پر آگئیں۔

اس کے علاوہ ویلور کی شورش 1806 کے بعد فوجیوں کی غیر سرکاری سیاسی انجمنوں کا قیام فوجی زندگی کی ایک عام خصوصیت تھی۔ ان انجمنوں نے 1860 اور 1849 کے دوران خاص طور پر پنجاب اور صوبہ سرحد میں ان وہابی راہنماؤں کے ساتھ راہ و رسم پیدا کر لی تھی جنھوں نے خفیہ کارندوں اور خانقاہوں کا ایک سلسلہ قائم کر کے سازش کا طریقۂ کار تیار کر لیا تھا۔ ان رواتوں اور رابطوں سے فوجیوں کی منتخب کمیٹیاں وجود میں آئیں جنھوں نے عملی طور پر 1857 میں دہلی و لکھنؤ کی حکومت سنبھال لی اور ساتھ ہی تربیت یافتہ فوجی بھی فراہم کیے جنھوں نے انگریزوں کے ساتھ لڑنے میں حیرت انگیز تدبر اور شجاعت کے جوہر دکھائے۔

یہ بات بھی اتنی ہی اہم ہے کہ 1857 تک انگریز مخالف تحریکوں کے راہنماؤں نے عوامی پروگرام مرتب کرنے کا چرچا شروع کر دیا تھا۔ نظام جاگیرداری کی اصلاح کی ضرورت کا احساس تو پہلے ہی موجود تھا۔ شاہ ولی اللہ کے زمانے سے کم از کم وہابی رہنماؤں کے دماغوں میں یہ خیال سمایا ہوا تھا۔ درحقیقت سلطان ٹیپو اس معاملے میں سبقت لے جا چکے تھے جب ان کی حکومت نے بیکاری دور کرنے کی ذمے داری سنبھال لی۔ سب سے زیادہ مشکل مسئلہ غریب اور بے زمین کسانوں کا تھا۔ بنگال کے فرائضیوں نے نہ صرف

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دور رس اثرات مرتسم ہوئے۔ یہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ پی. سی. جوشی کی مرتب کردہ اس کتاب میں مختلف شعبۂ حیات پر اس کے اثرات پر ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں کے بھی چند مقالات شامل کیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس انقلاب کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔ 359صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/75روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

زمینداری کو ختم کرنے بلکہ زمینداروں کو زمینوں سے محروم کرنے کا پروگرام بھی وضع کر لیا تھا۔ پس دہلی میں جب بخت خاں نے نمک اور کھانڈ کے محصول موقوف کر دیے اور ذخیرہ اندوزی کو قابلِ سزا قرار دیا تو وہ انگریزوں کی مخالف تحریک کے ایک دیرینہ مطالبے کو عملی جامہ پہنا رہا تھا۔ ایسے ہی اقدامات احمد اللہ اور فوجی کمیٹی نے لکھنؤ میں کیے۔ یہ ذکر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ ایک موقعہ پر دہلی کی باغی سرکار نے پانچ بیگھہ زمین معافی دائمی ملکیت کے طور پر ہر اس فوجی کے کنبہ کو عطا کرنے کی پیش کش کی جو انگریزوں کے خلاف لڑائی میں جان دے گا۔ درحقیقت بعض عالموں کی یہ رائے ہے کہ 1857 میں دہلی اور اودھ دونوں کے دیہات میں عوامی شورش نے کسانوں کی جنگ کی صورت بہت جلد اختیار کر لی جس سے صوبائی حکومت کے وہ لوگ جن کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا ڈر تھا اس قدر خوفزدہ ہو گئے کہ وہ آزاد قومیت کے تصور کو قربان کر کے فریق مخالف سے مل گئے۔

اس سے انکار نہیں کہ بعض اوقات محبانِ وطن عوام کے مذہبی تعصبات سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں زمانہ سازی کا ثبوت دیتے اور برطانوی حکام کی بعض رفاہِ عام کی اصلاحات کی مذمت کرتے مثلاً ستی کا انسداد، بیوہ کی دوبارہ شادی کی حوصلہ افزائی اور کچھ حد تک ذات پات میں تبدیلی چونکہ ہندو اور مسلمان عوام متحد تھے، دہلی کی باغی حکومت نے ہندوؤں کی دلجوئی کے لیے گائے کا ذبح کرنا ممنوع قرار دے دیا۔ اس کے عوض ہندو باغی رہنماؤں نے (مثلاً نانا صاحب) از روئے تحسین مغل سرکار کے تمام نشانات کو برقرار رکھا جیسے سن ہجری کا استعمال، سرکاری مراسلات اور اطلاعات میں ''بسم اللہ'' کا اندراج اور جمعہ کو سرکاری تعطیل۔

1857 کی بغاوت کے مقبول رہنماؤں نے اس بات کو محسوس کر لیا کہ دہلی کا نام نہاد بادشاہ بہادر شاہ جسے انگریزوں کے ہاتھوں کامل بربادی کا سامنا تھا۔ قومی اتحاد کی بے بہا نشانی تھا اور جس کے پیچھے ہندوستان کے مختلف فرقے اور طبقے اکٹھے ہو سکتے تھے۔ وہ نہ صرف اس بات پر متفق ہوئے کہ مرکزی حکومت کا تاج اس کے سر پر رکھا جائے اور دہلی کو اس کا پایۂ تخت قرار دیا جائے بلکہ مغلیہ دربار کی قدیم روایات و رسوم کو بھی برقرار رکھا جائے۔

ایسے مستقبل کے تصور سے احیائے اسلام کے حامیوں کو دلی مسرت ہوئی جو ایک مستحکم اور متحد حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے اور امیر تیمور اعظم کے خاندان کے ایک فرد کو امام اور بادشاہ کی حیثیت میں دیکھنے کے متمنی تھے۔ یہ بات قابلِ تعریف ہے کہ بادشاہ بہادر شاہ لوگوں کی توقعات پر پورے اُترے۔ احیائے اسلام کے حامی کی نگاہ میں وہ ایک غازی تھے۔ ایرانیوں یا لکھنؤ کے شیعوں کی نظر میں امام کا درجہ رکھتے تھے اور صوفی کے پیر و مرشد تھے جو ہندوؤں کے دستور کے مطابق مرید رکھتے ہیں۔ روشن خیال طبقہ بالعموم ان کی شعر نوازی اور علم دوستی کی داد دیتا تھا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اس بات کی طرف بھی اشارہ کیا تھا کہ حکومت کی بحالی کی صورت میں وہ تمام لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے لوگوں کو رعایتیں دیں گے۔ انھوں نے ہندو راجاؤں کو متبنّیٰ کرنے کا حق دینے کا وعدہ کیا۔ قدیم زمینداروں سے کہا کہ ان کا دوامی بندوبست منسوخ کر دیا جائے گا اور لگان میں کافی کمی کی جائے گی۔ ہندوستانی تاجروں سے کہا کہ برطانوی اجارہ داریوں اور بھاری ٹیکسوں کو ختم کر دیا جائے گا اور مال لانے لے جانے کے لیے امداد اور سہولتیں دی جائیں گی۔ انھوں نے وعدہ کیا کہ سرکاری ملازموں کی تنخواہ میں قابلِ قدر اضافہ کیا جائے گا۔ اعلیٰ افسروں کو کم از کم دو سو سے تین سو روپیہ تک ملیں گے اور سپاہیوں کا مشاہرہ دگنا کر دیا جائے گا۔ کاری گروں کو بھی روزگار کے تحفظ کا قول دیا گیا جو بے شک ان کی خوشحالی کی ضمانت تھا۔ درویش صفت بادشاہ نے پنڈتوں فقیروں اور دوسرے مقدس انسانوں کو یاد فرمایا جن کو اکبر یا عالمگیر کی سی شان کے ساتھ معافی کی آراضی بطور وقف عطا کرنے کی تجویز تھی۔ انصاف کا تقاضا ہے کہ ہم بہادر شاہ کے تحت محبانِ وطن کی مختصر حکومت کی داد دیں اور اعتراف کریں کہ دہلی، لکھنؤ، بریلی اور کئی دوسرے مقامات میں نئی سرکار کے عملے نے نہایت لیاقت، حسنِ انتظام اور ایمانداری کے ساتھ اپنے فرائض ادا کیے اور عارضی حکومت کی عزت کو دشمنوں کے ہاتھوں اس کا تختہ الٹ جانے کے بعد بھی برقرار رکھا۔

1857 کی عظیم قومی تحریک کی پشت پر کون سے راہنما تھے اس بارے میں بہت سی قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ بعض لوگ قدرتی طور پر یہ خیال کرتے ہیں کہ غالباً یہ بغاوت بہادر شاہ اور واجد علی شاہ کی سازش کا نتیجہ تھی جو شمالی ہندوستان کے دو ممتاز شاہی خاندانوں کے وارث تھے بلکہ یہ بھی خیال کیا جاتا ہے کہ انھوں نے مل کر ہندوستانی فوج کو برانگیختہ کیا اور فرنگیوں کے قتلِ عام کا منصوبہ باندھا جس کے بعد برطانوی فوج پر دوسرے ہندوستانی والیانِ ریاست کے حملے کی تجویز تھی۔ البتہ اس دعوے کی تائید میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ اس کے برعکس جو معلومات حاصل ہیں ان سے ظاہر ہے کہ اس وقت بھی جب عارضی حکومت کے معاملات میں ان کو کچھ اختیار حاصل تھا، انھوں نے کوئی خاص رول ادا نہیں کیا۔ 1857 میں پٹنہ کے ایک پیر علی نامی شخص کے گھر سے جو خطوط حاصل ہوئے ان سے پتہ چلتا ہے کہ وہابیوں کے علاوہ دہلی اور لکھنؤ کے حکمرانوں کی طرف سے دو جماعتیں علی الاعلان کام کر رہی تھیں مگر اس بات کا قطعی ثبوت نہیں ملتا کہ ان حکمرانوں کی طرف سے انھیں کوئی اختیار دیا گیا۔ دہلی کے شاہی خاندان کے افراد میں سے اگر کوئی فرد تحریک میں عملی طور پر حصہ

لینے اور اس کی رہنمائی کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہے تو وہ مغل شہنشاہ فرخ سیر کا پوتا شہزادہ فیروز شاہ تھا جس کو وہابی پٹھان کنگجسٹ کے ان سپاہیوں کی مدد حاصل تھی جو مرہٹہ حکمرانوں کی ملازمت سے برطرف ہونے کے بعد اس کے ساتھ مل گئے تھے۔ جہاں تک بیگم اودھ کا تعلق ہے ان کو فیض آباد کے مشہور مولوی سے ہدایت ملتی تھی جو ہر لحاظ سے "سازش کی روح رواں" کہلانے کا مستحق ہے۔ یہ وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اگرچہ احمد اللہ خالص وہابی نہ تھا یعنی اہل حدیث کے فرقے سے تعلق نہ رکھتا تھا مگر وہ اپنے دکنی ہم وطن سلطان ٹیپو کی طرح احیائے اسلام کا حامی یقیناً تھا اور اس نے اسی مقصد کے پیش نظر سیاسی اقتدار کی بحالی کے لیے کام کیا۔ بہر حال وہ سید احمد بریلوی کے پیروؤں اور وہابیوں کی جماعت کے ساتھ پورے طور پر تعاون کر رہا تھا۔ لیکن بغاوت کی سب سے سربرآوردہ شخصیت دہلی کی مرکزی حکومت کا سربراہ بخت خاں ہے جو سلطان پور (اودھ) کا رو ہیلہ سپاہی تھا۔ بخت خاں نے انگریزوں کے تحت فوجی تربیت کا کافی تجربہ حاصل کیا تھا۔ جب اس نے روبہ زوال شہزادہ مرزا مغل کی جگہ دہلی کی قوم پرست فوجوں کی کمان سنبھال لی تو اس نے سپہ سالار کا لقب اختیار کیا۔ بخت خاں ہر اعتبار سے ایک کٹر اور متعصب وہابی تھا جو وہابی تنظیم کاروں کے ایک دستے کے ساتھ دہلی آیا اور اپنے روحانی مرشد مولوی سرفراز علی کو ہزاروں مجاہدین کے لشکر کا امام مقرر کیا۔

یہ وہابیوں کے جوشِ عمل کا فیض تھا کہ شروع میں تدبیر جنگ کی سنگین غلطیوں اور شاہی خاندان کی سیاسی ناپختہ کاری کے باوجود فوج کا حوصلہ آخری دم تک بلند رہا۔ وہابی مجاہدین نے دشوار حالات میں نہ صرف جنگ کو جاری رکھا بلکہ دشمن پر وار کرنے میں پہل بھی کی حالانکہ محبانِ وطن کی قوت مزاحمت زائل ہو چکی تھی۔ وہابیوں کے جوش کا اندازہ کچھ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ بخت خاں کے لشکر میں ہر فوجی نے انگریزوں کے ساتھ آخری دم تک لڑنے کا حلف لیا تھا۔ جب دہلی فتح ہو گئی تو پہلے بخت خاں نے بہادر شاہ کو یہ ترغیب دینے کی کوشش کی کہ وہ اس کے ساتھ چلے اور کسی بہتر مقام پر دوسرا محاذ پیدا کرنے میں مدد دے۔ جب بادشاہ نے انکار کر دیا تو بخت خاں محمدی میں احمد اللہ کی عارضی حکومت میں سرفراز علی قاضی القضاۃ اور نانا صاحب وزیر اعظم مقرر ہوئے۔ آخر جب برطانوی حملے کی تاب نہ لا کر انھیں محبانِ وطن کے آخری گڑھ، محمدی، سے دست بردار ہونا پڑا اور احمد اللہ کو دغا بازی سے ہلاک کر دیا گیا تو بخت خاں نانا صاحب اور دوسروں کے ساتھ سرحد پار کر کے نیپال میں داخل ہو گیا۔

بخت خاں اور وہابیوں کے تحت دہلی کا نظام حکومت جمہوری پالیسیوں کے اعتبار سے قابل مطالعہ ہے۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ بخت خاں نے عام استعمال کی چیزوں مثلاً نمک اور کھانڈ پر محصول ہٹا دیا تھا۔ ذخیرہ اندوزی کو قابل سزا جرم قرار دیا تھا اور پانچ بیگھہ زمین معافی دائمی حقوق ملکیت کے ساتھ ہر اس سپاہی کے کنبے کو عطا کرنے کی پیش کش کی تھی جو انگریزوں کے ساتھ لڑنے میں اپنی جان دے گا۔

بخت خاں کے تحت حکومت کی بنیاد عوام کی حمایت اور فوج (جس میں اکثریت باہر سے آنے والوں کی تھی) اور شہر کے صنعت کاروں اور مزدوروں کے تعاون پر تھی۔ بخت خاں خود تحریک احیا کا روح رواں تھا۔ اس کی عادتیں سادہ تھیں اور وہ عام سپاہی کی طرح زندگی بسر کرتا اور چلتا پھرتا تھا۔ جب پہلی بار دہلی میں وارد ہوا تو اُسے کوئی پہچان بھی نہ سکا اور اس کی بھدی صورت سادہ لوحی اور ناشائستہ طور طریقوں کا مذاق اڑایا گیا لیکن وہ انگریزوں کے ساتھ ہفتوں لڑا اور انھیں سپہ سالاری میں مات کیا۔ اس نے اس بات کی پوری لیکن ناکام کوششیں کیں کہ فوج کے ہاتھوں دہلی کی شہری آبادی کو کوئی تکلیف نہ ہو اور ہر حالت میں ضابطوں کی پابندی سختی کے ساتھ عمل میں لائی جائے۔ جب بخت خاں دہلی میں وارد ہوا اور فوجی کمیٹی کا قیام عمل میں آیا جس کا آئین جمہوری تھا اور جس کے قواعد کی پابندی پر زور دیا گیا تو شاہی خاندانوں کے ذلیل طبع فوجی سرداروں اور امیروں کا وہ انبوہ جن پر بہادر شاہ کی عارضی حکومت کی مجلس مشاورت پہلے چند ہفتوں کے دوران مشتمل تھی یکسر منتشر ہو گیا۔

1857 کے ہنگامے سے بہت پہلے وہابی تحریک کے رہنما شمالی ہندوستان کے تمام اہم مراکز میں اپنی تنظیم کا جال بچھا چکے تھے اور علاقائی خلیفہ اور معتبر کارکن مقرر کر چکے تھے۔ 1831 میں سید احمد بریلوی کی وفات کے بعد انھوں نے دکن کے مسلم مراکز جیسے حیدرآباد اور میسور اور وسطی ہندوستان اور راجپوتانہ کی بعض ریاستوں مثلاً بھوپال، ٹونک اور جے پور وغیرہ کے ساتھ بھی رابطہ قائم کر لیا تھا، چھاؤنیوں اور ہندوستانی سپاہ کی فوجی کمپنیوں میں ان کا اثر و رسوخ 1840 ہی میں ظاہر تھا۔ مختصر یہ کہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ 1857 تک وہابیوں نے ایک ملک گیر سیاسی تنظیم قائم کر لی تھی۔ خاص طور پر علاقہ دوآب میں یعنی دہلی سے الہ آباد تک ہر قابل ذکر قصبے میں وہابیوں اور دوسرے احیائے اسلام کے حامیوں کا منظم اور کارکن گروہ موجود تھا جو انگریزوں سے نفرت کرنے میں متحد اور عام بغاوت میں شریک ہونے کے لیے بیتاب تھا۔ درحقیقت اسی نے وہ سیاسی اور تنظیمی بنیاد فراہم کی جس نے بخت خاں اور دوسرے وہابی رہنماؤں کو دہلی کی عبوری حکومت سنبھالنے میں مدد دی۔

1857 کا آغاز ملک کے دیہاتوں میں چپاتیوں کی تقسیم کے ساتھ ہوا ساتھ ہی یہ افواہیں پھیلائی گئیں کہ برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے والا ہے اور ہندوستانی فوجی کمپنیوں میں مشورے ہونے لگے اس کے جلد بعد بارک پور میں کارتوسوں کا واقعہ ہوا۔ پھر یہ آثار دکھائی دینے لگے کہ کوئی نہ کوئی عام شورش بپا

ہونے والی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لوگوں میں سرگوشیوں کی مہم کے ذریعے سارے شمالی ہندوستان میں ایسی شورش کی مقررہ تاریخوں کا بھی عوام میں اعلان کر دیا گیا۔ ساتھ ہی اعلیٰ سطح پر رہنماؤں نے ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ قائم کیا جیسے احمد اللہ جس کا تعلق مسلمانوں کی مختلف جماعتوں اور نانا صاحب کے ساتھ تھا جو ہندو طبقۂ امراء کا نمائندہ تھا۔ یہ رہنما ایک طریق کار پر متفق ہوئے جسے عوام کے ادنیٰ طبقوں میں ہر قسم کے مقامی لوگوں کے ذریعہ اشاعت دی گئی۔ مثلاً علما، تاجر، قدیم زمیندار، بلکہ عام سادھو اور فقیر۔ بہر حال میرٹھ کے ہندوستانی فوجی اور شہر دہلی، کے دربان جانتے تھے کہ 10 مئی 1857 سے متعلق کون سے کام ان کے ذمے ہیں۔ جوں ہی میرٹھ کے سواروں کے وارد ہونے کا اشارہ ملا اور بہادر شاہ کے تحت دہلی میں عارضی حکومت کا اعلان ہوا، سارے شمالی ہندوستان بالخصوص ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی وہابی تنظیموں کا سلسلہ حرکت میں آ گیا۔ روایت کے عین مطابق مذہب کی شیدائی ہر جماعت کے اراکین نے جہاد کے لیے پہلے امیر کا انتخاب کیا۔ پھر اپنے آپ کو اس کے ہاتھوں پر بیعت کا پابند کیا۔ پھر انھوں نے اسلام کا سبز علم لہراتے ہوئے ایک جلوس نکالا۔ مجاہدین کو بھرتی کی دعوت دی اور جہاد سے متعلق فتوی کو اشاعت دی۔ اسی اثنا میں اسلحہ خانے پر حملہ کیا گیا، خزانے کو لوٹا گیا اور جیل خانے کے پھاٹک کھول دیے گئے۔ کاغذات مالگذاری جلا دیے گئے، ساہوکاروں کو مجبور کیا گیا کہ قرضوں کو قلم زد کر دیں۔

اس کے بعد حسب موقع برطانوی بیرکوں یا مقامی انگریز افسروں پر مسلح حملے ہونے لگے۔ دہلی کی مرکزی سرکار سے درخواست کی گئی کہ وہ اپنے کسی آدمی کو اس علاقے کے لیے بحیثیت ناظم نامزد کرے۔ جب ایسا نہ ہوا تو انھوں نے اپنی مقامی جماعت کے سربراہ کو یہ اختیارات تفویض کر دیے۔ بہر حال علاقے کے نئے نظام حکومت میں عوام کو موثر دخل حاصل تھا۔ اگر اس بستی میں کوئی باقاعدہ فوجی دستہ موجود ہوتا تو تمام معاملات منتخب فوجی مجلس کے سپرد کر دیے جاتے۔

لکھنؤ: جوں ہی 30 مئی کو شہر میں بغاوت کی خبر پھیلی، لکھنؤ کے وہابیوں نے سبز علم لہرایا اور گلیوں بازاروں میں گشت لگایا۔ ان کے پیچھے ایک ہزار پانچ سو لوگوں کا ہجوم تھا۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف جہاد میں بطور مجاہد بھرتی ہونے کے لیے لوگوں سے اپیل کی۔ مناسب مدت گزرنے پر انھوں نے مشہور مولوی احمد اللہ کو جو پھانسی کے منتظر تھے جیل خانے سے رہا کر دیا اور ان سے تحریک کی رہنمائی قبول کرنے کی درخواست کی۔ درحقیقت احیائے اسلام کا جذبہ اس قدر شدید تھا کہ عارضی حکومت کے فوجی سالار نے خود سبز علم کو سرکاری جھنڈے کا درجہ دیا اور اس کے تقدس کو بڑھانے کے لیے قرآن مجید کا ایک نسخہ اس کے ساتھ باندھا۔ مناسب مدت کے بعد دوسرے فرقوں کے جھنڈے بھی نمودار ہو گئے اور ہر جماعت نے اپنے جھنڈے کو اونچے سے اونچا لہرانے کی کوشش کی۔

پٹنہ: پٹنہ میں اس سے پہلے کہ صادق پور کے وہابی رہنما کوئی قدم اٹھا سکتے انگریز کمشنر نے ان کو گرفتار کر لیا۔ البتہ ایک مقامی کتب فروش نے جس کا وہابی مرکز کے ساتھ قریبی تعلق تھا تحریک مزاحمت کی قیادت سنبھال لی اور مجاہدین کا ایک مسلح دستہ منظم کیا۔ اس ہنگامے میں ایک انگریز کی موت واقع ہوئی۔ شورش اتنے بڑے پیمانے پر تھی کہ اس کو فرد کرنے کے لیے سکھ سپاہیوں کو بلوانا پڑا۔

آگرہ: آگرے کے لوگوں نے فوراً مشہور وہابی عالم اور سرجن ڈاکٹر وزیر خاں کی سرکردگی میں مجاہدین کا ایک لشکر تیار کیا اور قلعے میں مقیم برطانوی فوج کا محاصرہ کر لیا مگر ڈاکٹر وزیر خاں کی اہمیت اس سے کہیں زیادہ تھی جسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اسے وہابیوں کے مرکزی رہنماؤں کے زمرے میں شامل کیا گیا وہ بخت خاں اور سرفراز علی کے پیچھے پیچھے پہلے دہلی آیا اور پھر لکھنؤ اور محمدی اس کے بعد وہابی مقامی تحریک مزاحمت میں شامل ہو گئے۔

حیدرآباد: مبارز الدولہ کے عہد سے ہی حیدرآباد وہابیوں کا ایک طاقتور مرکز تھا۔ مسلمان فوجیوں میں احیائے اسلام کا جذبہ خاص طور پر شدت کے ساتھ پایا جاتا تھا۔ 1857 کی ہلچل کے دوران اگرچہ نظام نے مسلمانوں کو تحریک میں شرکت کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی لیکن دو مشہور وہابی رہنماؤں طرہ باز خاں اور مولوی علاء الدین نے برطانوی ریزیڈنسی پر ایک فوجی حملے کی تنظیم کی۔ یہ حملہ ناکام ہو گیا اور وہابی رہنما گرفتار کر لیے گئے۔ بعد میں طرہ باز خاں کو گولی سے اُڑا دیا گیا اور مولوی علاؤ الدین کو جلا وطن کر کے انڈمان بھیج دیا گیا۔

الٰہ آباد: جوں ہی بغاوت کی خبر الٰہ آباد پہنچی قلعہ میں مقیم ہندوستانی فوجیوں نے برطانوی افسروں کو قتل کر ڈالا اور گولہ بارود اور فوجی گودام پر قبضہ کر لیا۔ اس اثنا میں مشہور وہابی رہنما لیاقت علی نے جو پہلے جیل میں رہتا تھا اور پھر الہ آباد شہر میں سکونت اختیار کر لی تھی، بہادر شاہ کے نام پر سبز علم لہرایا اور قوم پرست فوجوں کے رہنما رام چندر کے ساتھ مل کر الٰہ آباد سرکار کا صدر مقام خسرو باغ میں قائم کیا۔

لیاقت علی کو یا تو دہلی کی مرکزی حکومت کی طرف سے اختیارات ملے تھے یا مقامی رہنماؤں نے اسے ضروری اختیارات تفویض کیے۔ بہر حال دہلی کے بادشاہ کی طرف سے وہ صوبیدار الہ آباد کی حیثیت سے فرائض انجام دیتا رہا۔ وطن دوست سپاہیوں کی ابتدائی فتح کے بعد انھیں شکست ہوئی اور انگریزوں نے اُسے معزول کر دیا۔ اس کے بعد لیاقت علی لکھنؤ میں احمد اللہ کے ساتھ جا ملا اور تحریک مزاحمت میں شریک ہو گیا یہاں تک کہ اُسے نیپال کی سرحد پر گرفتار کر لیا گیا۔

اسی قسم کے چھوٹے پیانے پر ہنگاموں کی اطلاعات علی گڑھ، شاہجہاںپور، بریلی، پانسی اور کئی دوسرے مقامات سے بھی وصول ہوئیں۔ پنجاب اور صوبۂ سرحد میں چھاونیوں کے علاقے بھی مستثنیٰ نہ تھے۔

شاملی: میرٹھ کے نزدیک شاملی میں احیائے اسلام کے حامیوں کی مقامی جماعت نے اپنا امام وسالار اور قاضی منتخب کیا تاکہ باغی سرکار کا بنیادی مرکز قائم کیا جائے پھر انگریزوں کے مقامی توپ خانہ پر حملہ کرنے کے لیے فی الفور مسلح مجاہدین کو منظم کیا۔ چوں کہ تحریک مزاحمت جلد ہی ناکام ہوگئی اور دہلی کی عارضی حکومت ٹوٹ گئی۔ شاملی کی شورش کے رہنما عرب کو ہجرت کر گئے البتہ محمد قاسم نے جو شاملی کی مہم میں شریک تھے دیوبند کے دارالعلوم کی بنیاد رکھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے ادارے کے بنیادی قواعد مرتب کیے اور اپنے مریدوں کو سرکاری امداد قبول کرنے سے منع کیا، انگریزی زبان کی تعلیم بھی ممنوع قرار دی۔

1857 کے انقلاب کے بعد کئی مقامات پر ساری مسلم آبادی کو قتل کر دیا گیا۔ تمام شمالی ہندوستان میں وہابی رہنماؤں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر گرفتار کیا گیا تاکہ انھیں پھانسی دی جائے۔ ان میں سے سینکڑوں کو جن میں ممتاز علما بھی شامل تھے توپوں سے اڑا دیا گیا۔ بہتوں کو انڈمان بھیج کر ملک بدر کر دیا گیا۔ درحقیقت انڈمان میں قیدیوں کا جو پہلا جتھا پہنچا اس میں بغاوت کے ایسے مشہور ومعروف وہابی رہنما بھی شامل تھے جیسے دہلی کے مفتی مظہر کریم اور لکھنؤ کے منشی عنایت احمد۔ ان کے پیچھے پیچھے انبالہ (1865) اور پٹنہ (1869) کے وہابی مقدمات کے مجرم بھی پہنچ گئے۔ بہار کی کے پٹنے پٹنہ کے مولانا احمد اللہ نے جسے جلاوطن کر کے انڈمان بھیجا گیا۔ وائسرائے ہند لارڈ میو کے قتل کی سازش منظم کی۔ جب 1872 میں وہ سرکاری دورے پر اس بستی میں وارد ہوا۔ یہ وہابی رہنماؤں کے غیر فانی جوش اور استقلال کی قابل قدر شہادت ہے۔ اس اثنا میں ستانہ کا وہابی مرکز کام کرتا رہا۔ ''مرکز جس کے ساتھ ہماری بے وفا رعایا اور سرحد پار کے دشمنوں کی امیدیں یکساں طور پر وابستہ ہیں۔'' (ہنٹر)

1888 میں جب سرسید احمد خاں نے مجلس ملی کی بنیاد رکھی تاکہ مسلمانوں کو انڈین نیشنل کانگریس سے علیحدہ کر دیا جائے تو لدھیانہ (پنجاب) کے وہابیوں نے کانگریس کی حمایت میں فتووں کی ایک کتاب بعنوان نصرت الابرار شائع کی۔ یہ کتاب ایک سو فتووں پر مشتمل تھی جن میں دو فتوے دیوبند کے رہنماؤں کے تھے۔ اسی طرح جب پہلی عالمگیر جنگ چھڑی تو سرحد پر واقع وہابی مرکز نے کابل میں پہلی ''آزاد حکومت ہند'' کے قیام میں نمایاں حصہ لیا۔ وہابیوں نے مہاتما گاندھی کی شروع کی ہوئی تحریک عدم تعاون میں بھی شرکت کی اور اس کی رہنمائی بھی کی۔ ایک وہابی مرکز اب بھی سرحد پر موجود ہے گو اسے کوئی سیاسی اہمیت حاصل نہیں ہے۔

فضل حق خیرآبادی 1857 کے مسلمانوں کی روح تھے، اگرچہ اصطلاحاً وہ خود وہابی نہ تھے بلکہ ان کے عقائد اور مذہبی رسوم کے مخالف تھے پھر بھی انھوں نے استقلال کے ساتھ انگریزوں کے خلاف وہابیوں کی سرگرمیوں کی حمایت کی۔ انھوں نے اپنی کتاب ''رسالہ غدریہ'' میں جو انڈمان میں ان کی قید کے دوران شستہ عربی میں لکھی گئی۔ انھوں نے اپنے برطانیہ دشمن موقف کو واحد صحیح راستہ قرار دیا جو ایک مسلمان اختیار کر سکتا تھا خواہ وہ وہابی ہو یا غیر وہابی۔ اس سے 1857 کے واقعات میں وہابیوں کو بحیثیت مجموعی مسلمانوں کے تسلیم شدہ رہنما بننے میں مدد ملی اگر برطانوی حکام وہابیوں کو ایک جنگ باز طبقہ اور سلطنت کے لیے مستقل خطرے کا سبب تصور کرتے تھے تو اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں۔

□□□

حیات جاوید

مصنف: الطاف حسین حالی

مولانا الطاف حسین حالی نہ صرف ایک رجحان ساز شاعر اور نقاد تھے بلکہ انھوں نے سوانح نگاری میں بھی اپنا لوہا منوایا اور ''حیات سعدی''، ''یادگار غالب'' اور ''حیات جاوید'' جیسی کتابیں یادگار چھوڑیں۔ ''حیات جاوید'' میں حالی نے سرسید کی زندگی کے حالات، افکار اور خیالات پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ اس کتاب کی اہمیت یوں بھی ہے کہ حالی سرسید سے بے حد قریب تھے اور سرسید نے ملک وقوم کی جو خدمت کی اس کے عینی شاہد۔

پانچواں ایڈیشن، صفحات: 907، قیمت: -/181 روپے

کلیات چودھری محمد علی ردولوی (تین جلدوں میں)

ترتیب وتدوین: مسعود الحق

چودھری محمد علی ردولوی اپنے زمانے کے ایک روشن خیال اور شگفتہ نگار ادیب تھے۔ ان کا تعلق انیسویں صدی کے ادیبوں کی اس نسل سے تھا جس میں ولایت علی بمبوق، سجاد حیدر یلدرم، پریم چند، مولانا ابوالکلام آزاد اور نیاز فتح پوری وغیرہ شامل تھے۔ اس کلیات میں ان کی تمام تحریریں جمع کر دی گئی ہیں۔

جلد اول، صفحات: 344، قیمت: -/172 روپے
جلد دوم، صفحات: 455، قیمت: -/172 روپے
جلد اول، صفحات: 450، قیمت: -/172 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی-066 110

تحریر: سنجیو کمار
ترجمہ: امتیاز عالم

لائبریری سائنس میں کیرئیر

کتب خانہ اہم اطلاعات جمع کر کے انھیں ہر آدمی تک پہنچانے کا کام تو کرتا ہی ہے، اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ عصر حاضر میں نوجوانوں کو بہترین کیرئیر کے مواقع بھی فراہم کرا رہا ہے۔ اس میں کیریر بنانے کے خواہش مند افراد کی تقرری لائبریرین، اسسٹنٹ لائبریرین اور ٹیکنکل اسسٹنٹ وغیرہ عہدوں پر ہوتی ہے۔

لائبریری سائنس میں صرف اطلاعات کو منظم طور سے جمع کرنے پر ہی توجہ نہیں دی جاتی بلکہ انھیں اس طرح سے جمع کیا جاتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر پلک جھپکتے ہی استعمال بھی کیا جا سکے۔

تکنیک کی ترقی کے ساتھ ساتھ لائبریری میں جمع کی جانے والی اطلاعات کی نوعیت میں بھی تبدیلی آئی ہے۔ لائبریری میں کتابوں کے علاوہ سی.ڈی.، ڈی.وی.ڈی.، فلاپی ڈسک وغیرہ بھی رکھی جانے لگی ہیں۔ ان کو بھی بالکل کتابوں کی طرح ہی منظم انداز میں رکھنا پڑتا ہے۔ یہ کام صرف تربیت یافتہ افراد ہی کر سکتے ہیں۔ لائبریری سائنس اور اس سے تعلق رکھنے والے دیگر کورسوں میں ان تمام امور سے واقف کرایا جاتا ہے۔ آج کل ڈجیٹل اور آن لائن لائبریری کے رواج میں بھی کافی اضافہ ہوا ہے۔

کورس: زیادہ تر یونیورسٹیوں میں لائبریری سائنس کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ ان کورسوں میں مندرجۂ ذیل سب سے زیادہ اہم ہیں۔

- ماسٹر اِن لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس۔
- بیچلر ان لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس۔

ان کے علاوہ مختلف اداروں کے ذریعے ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورس بھی کرائے جاتے ہیں۔ ماسٹر اِن لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس ایک سال کا کورس ہے اور اس کورس میں داخلے کے خواہش مند افراد کے لیے لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس میں گریجویٹ ہونا لازمی ہے۔ بیچلر ان لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس بھی یک سالہ کورس ہے جس میں داخلے کے لیے کسی بھی مضمون میں گریجویٹ ہونا ضروری ہے۔ اس کورس میں طلبہ کو کتب خانوں کی عملی معلومات فراہم کرائی جاتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ کتب خانوں کی جانب سے فراہم کرائی جانے والی خدمات اور ضروریات سے بھی روشناس کرایا جاتا ہے۔ کورس کے تحت جن خاص مضامین کی تعلیم دی جاتی ہے وہ ہیں: کلاسیفکیشن تھیوری اور پریکٹس، لائبریری منجمنٹ، کیٹلاگ، ٹیکنکل رائٹنگ، انفارمیٹکس، سائنٹومیٹکس وغیرہ۔ کورس میں طلبہ کو قدیم دستاویزات اور مخطوطات کی نگہداشت اور ان کی درجہ بندی سکھائی جاتی ہے جو کسی بھی کتب خانے کا خاص پہلو ہوتا ہے۔ اطلاعاتی انقلاب کے اس زمانے میں کتب خانے کمپیوٹر سے بھی خوب استفادہ کر رہے ہیں۔ کتب کو بھی آن لائن اور کمپیوٹرائز کیا جا رہا ہے۔ اس لیے اس کورس میں طلبہ کو کمپیوٹر کی بھی تعلیم دی جاتی ہے۔ کئی اداروں کے ذریعے کتب خانوں کو کمپیوٹرائز کرنے کے لیے الگ سے کمپیوٹر اور نیٹ ورکنگ کورس بھی شروع کیے گئے ہیں جس کے تحت پروگرامنگ زبانوں مثلاً سی پلس پلس، جاوا، ویژول بیسک اور انٹرنیٹ کی خصوصی تربیت دی جاتی ہے۔ کورس کے دوران کسی کتب خانے میں پروجیکٹ بھی کرایا جاتا ہے۔

داخلہ: ملک کی زیادہ تر یونیورسٹیوں میں اس کورس میں داخلے کے لیے امتحان دینا پڑتا ہے اور داخلہ امتحانات عموماً جولائی میں ہوتے ہیں۔

روزگار: لائبریری سائنس میں تربیت یافتہ طلبہ کے لیے مواقع کی کوئی کمی نہیں ہے۔ حکومت اور نجی اداروں کے زیر انتظام بہت سارے کتب خانے چلائے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ موجودہ دور میں جس طرح تمام سرکاری اور غیر سرکاری اداروں میں کتب خانے قائم کرنے کا رجحان شروع ہوا ہے اس سے اس مضمون کے ماہرین کے لیے روزگار کے مواقع کافی بڑھ گئے ہیں۔

لائبریری سائنس کو اطلاعات کی ذخیرہ اندوزی کی سائنس بھی کہا جاتا ہے اور آج زمانہ اطلاعات کا ہی ہے۔ سبھی لوگوں کو مختلف موضوعات پر معلومات درکار ہیں اور وہ بھی جلد از جلد، ایسے میں لائبریری سائنس میں کیرئیر بنانے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ اس مضمون میں اس کورس سے متعلق معلومات فراہم کرائی جا رہی ہیں۔

علاوہ ازیں تعلیمی اداروں، صحافتی اور اشاعتی اداروں کا تو اپنا کتب خانہ ہوتا ہی ہے جہاں ان ماہرین کی تقرری لائبریرین، اسسٹنٹ لائبریرین اور ٹیکنکل اسسٹنٹ وغیرہ عہدوں پر ہوتی ہے۔

لائبریرین کا کام محض کتب خانے کا نظم ونسق سنبھالنا ہی نہیں ہے بلکہ کسی کتب خانے کو کس طرح زیادہ سے زیادہ ترقی یافتہ اور مقبول بنایا جائے، یہ کام بھی اس کے ذمے ہوتا ہے۔

اہم ادارے:

- ڈپارٹمنٹ آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس، دہلی یونیورسٹی، دہلی۔
  ویب سائٹ: www.du.ac.in
- ڈپارٹمنٹ آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
  ویب سائٹ: www.lkouniv.ac.in
- ڈپارٹمنٹ آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی۔
  ویب سائٹ: www.jmi.nic.in
- سوشل سائنس ودیا پیٹھ، اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی، نئی دہلی۔
  ویب سائٹ: www.ignou.ac.in
- ڈپارٹمنٹ آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس، بنارس ہندو یونیورسٹی، بنارس
  ویب سائٹ: www.bhu.ac.in
- ڈپارٹمنٹ آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس، ممبئی یونیورسٹی، ممبئی
  ویب سائٹ: www.mu.ac.in
- ڈپارٹمنٹ آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس، کولکاتہ یونیورسٹی، کولکاتہ
  ویب سائٹ: www.caluniv.ac.in
- ڈپارٹمنٹ آف لائبریری اینڈ انفارمیشن سائنس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
  ویب سائٹ: www.amu.ac.in

(بشکریہ: "ہندستان" نئی دہلی، 4 جولائی 2006)

□□□

انیس کے مرثیے

مرتبہ: بیگم صالحہ عابد حسین

میر انیس کے مرثیوں کے متعدد مجموعے شائع ہوئے ہیں لیکن یہ ان کے پورے کلام کو محیط نہیں اور ان میں بیشتر میں صحت متن کا بھی زیادہ خیال نہیں رکھا گیا ہے۔ یہ کتاب بیگم صالحہ عابد حسین نے تدوین کے جدید اصولوں کو سامنے رکھتے ہوئے دو جلدوں میں مرتب کی ہے جس میں انیس کے تمام دستیاب مرثیے شامل ہیں۔ ہر جلد کے ساتھ مفصل مقدمہ بھی ہے اور ایسے الفاظ کی فرہنگ بھی جواب کم مستعمل ہیں یا معنوی تغیر سے دوچار ہوئے ہیں۔

جلد اول، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 540، قیمت: -/36 روپے

جلد دوم، دوسرا ایڈیشن: صفحات: 575، قیمت: -/40 روپے

کاشف الحقائق

مصنف: سید امداد امام اثر

سید امداد امام اثر کی یہ بلند پایہ تصنیف دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں یوروپی ادبیات کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں مشرقی ادبیات کی خصوصیات واضح کی گئی ہیں۔ شعر وادب اور دیگر فنون لطیفہ میں جو باہمی قربت و موانست ہے، اس کا بھی ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں اردو شاعری کی تمام اصناف اور ہر صنف کے نمائندہ شاعروں کا تفصیلی بیان ہے جو تجزیاتی انداز کا حامل ہے۔ اس ایڈیشن کی ایک خصوصیت پروفیسر وہاب اشرفی کا بسیط مقدمہ ہے جس میں انھوں نے کتاب کے تمام اہم پہلوؤں کا جائزہ لیا ہے۔

دوسرا ایڈیشن: صفحات: 740، قیمت -/145 روپے

نوٹ: طلبہ کے لیے 45% اور اساتذہ کے لیے 40% کی خصوصی رعایت۔

تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، ونگ-7، آر. کے. پورم، نئی دہلی۔ 110 066

اردو خبر نامہ

اردو ہندی کے تخلیقی رشتے پر سیمینار

● نئی دہلی، یکم جولائی۔ دہلی کی ادبی تنظیم ’ذہن جدید فورم‘ کے تحت دہلی اردو اکیڈمی اور غالب انسٹی ٹیوٹ کے اشتراک سے ’’اردو ہندی کے تخلیقی رشتے‘‘ پر ایک روزہ سیمینار غالب انسٹی ٹیوٹ میں منعقد ہوا۔ ’ذہن جدید فورم‘ کے صدر زبیر رضوی نے کہا کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ اردو کی ادبی فضا میں حال ہی میں شائع ہونے والی ایک کتاب کے متنازعہ پہلوؤں پر ردعمل کی ہلچل مچی ہوئی ہے اور اردو ہندی کے درمیان پرانے لسانی تنازعہ اور اردو والوں کے ذریعے اردو اور غیر اردو والوں کے درمیان امتیاز برتنے کی الزام تراشیوں پر سوال وجواب کا سلسلہ جاری ہے۔ یہ سیمینار ان تمام متعصب ذہنوں کے لیے ایک مدلل جواب ہوگا جو تعصبات اور سطحی نوعیت کی بے بنیاد الزام تراشیوں کو ہوا دینے کی مہم میں لگے رہے ہیں۔

انھوں نے کہا کہ آزادی کے بعد کے برسوں میں دونوں زبانوں کے درمیان غیریت اور لاتعلقی کا ماحول اور تناؤ کم ہوا ہے، تخلیقی سطح پر شاعری اور افسانے کی تفہیم کا دائرہ بڑھا ہے۔ اردو افسانہ نگار دیوندر اسر نے سیمینار کے موضوع اور اس کے مختلف پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ خالص لسانی اور عمرانی تاریخ کی بحث میں الجھے بغیر محض تخلیقیت کی سطح پر دونوں زبانوں کے ادب کو پڑھنا بھی ہوگا اور ان کا تجزیاتی مطالعہ بھی کرنا ہوگا۔

ڈاکٹر صادق نے اردو ہندی کے لسانی تنازعہ کا ذکر کرتے ہوئے یہ اعتراف کیا کہ آزادی کے بعد بدلے ہوئے ماحول کے باوجود اردو ادیب اور اردو زبان کے ساتھ امتیازی برتاؤ برقرار ہے۔ انھوں نے دونوں زبانوں کے درمیان تخلیقی ادب پر مکالمے اور مباحثے کی ضرورت پر زور دیا۔ ہندی نقاد جانکی پرساد شرما نے لسانی تنازعات کو بھول کر دونوں زبانوں کے درمیان تخلیق اور افکار کی سطح پر لین دین پر زور دیا۔

ہندی شاعر منگلیش ڈبرال نے اردو اور اس کے تخلیقی ادب کے بارے میں کہا کہ وہ اردو کے بغیر نئی ہندی بھاشا کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندی ادب کے لیے اردو بطور زبان ایک تخلیقی ضرورت ہے۔ انھوں نے کہا کہ میری تخلیقی زبان جو اردو کے خمیر سے تیار ہوئی ہے اسے آج کئی طرف سے خطرات کا سامنا ہے۔

ہندی ماہنامہ ’’ہنس‘‘ کے مدیر راجیندر یادو نے اردو رسم الخط کے سلسلے میں اپنا پرانا موقف دہرایا۔ صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ آج ترجمے کے ذریعے پوری دنیا کے ادب کا مطالعہ ممکن ہے۔ انھوں نے اردو اور ہندی کے درمیان لین دین پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اردو کے زیر اثر ہندی میں غزل اور رباعی اور ہندی کے زیر اثر اردو میں گیت اور دوہے لکھے جا رہے ہیں۔

ہندی کے ممتاز شاعر وشنو کھرے نے راجندر یادو کے رسم الخط بدلنے کے مشورے پر شدید برہمی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ نہ ملک میں، نہ دنیا میں کہیں ایسا ہوا ہے کہ رسم الخط بدلنے کی بنا پر لوگوں نے اس زبان کو جوش و خروش سے پڑھنا یا سیکھنا شروع کیا ہو، یہ نہایت سطحی اور عامیانہ مطالبہ ہے جس کی کوئی ٹھوس بنیاد نہیں ہے۔ انھوں نے دعویٰ کیا کہ غالب اور میر جیسی بڑی اور آفاقی تناظر کی حامل شاعری ہندی کے پاس تو ہے ہی نہیں اس کی کوئی مثال سنسکرت سے بھی نہیں دی جا سکتی۔ انھوں نے کہا کہ اردو کی زبان کی حیثیت سے ایک خوبی یہ ہے کہ اس کے اشعار اور جملے زبان زد ہو جاتے ہیں۔ جلسے میں ممتاز ترقی پسند ہندی نقاد پنکج بشٹ اور جے این یو میں ہندی کے استاد ڈاکٹر گوبند پرشاد نے بھی اظہار خیال کیا۔ (قومی آواز، دہلی)

امیر خسرو کی شخصیت، فن اور خدمات پر سیمینار

● پنچکولہ۔ ہریانہ اردو اکادمی اور چنڈی گڑھ دور درشن کے اشتراک سے امیر خسرو کی شخصیت، فن اور خدمات پر دو روزہ کل ہند سیمینار کا اہتمام کیا گیا جس کا افتتاح ڈاکٹر اے آر قدوائی گورنر ہریانہ نے کیا۔

جناب بیریندر سنگھ، وزیر خزانہ ہریانہ، پھول چند ملانا، وزیر تعلیم ہریانہ، ایچ کے دوا، ایڈیٹر ان چیف ’’دی ٹریبون‘‘ چنڈی گڑھ اور جناب وی این پاٹھک، وائس چانسلر پنجاب یونیورسٹی نے مہمان خصوصی کے طور پر شرکت کی۔ افتتاحی کلمات میں ڈاکٹر اے آر قدوائی نے امیر خسرو کی صوفیانہ طبیعت، اردو زبان کی نشو ونما میں ان کی خدمات اور حب الوطنی کے جذبے پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو گنگا جمنی تہذیب کے علم بردار تھے، ان کی خدمات کو عام کیا جانا چاہیے۔ اردو زبان کے بارے میں انھوں نے کہا کہ زبان وہی زندہ رہتی ہے جو استعمال میں آتی رہتی ہے اور تہذیب وثقافت کا اہم جز و بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اردو اگر زندہ ہے تو اپنی خوبیوں کی وجہ

سے ہے۔ حضرت امیر خسرو اس زبان کے ابتدائی معمار کہے جا سکتے ہیں جنھوں نے اس زبان سے اتحاد اور سماجی فلاح کا کام لیا۔

جناب بیریندر سنگھ نے کہا کہ تقسیم ملک کے بعد سب سے زیادہ نقصان مشترکہ پنجاب اور یہاں کی تہذیب کو پہنچا ہے۔ اردو کو یہاں پہلی زبان کا درجہ حاصل تھا لیکن تقسیم کے بعد یہ زبان اس علاقے میں زوال پذیر ہوگئی۔ اپنی تہذیب کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ اس علاقہ میں ایک ثقافتی مرکز قائم کیا جائے تاکہ انسان کو انسان کے قریب کیا جائے۔ جناب پھول چند ملانا نے کہا کہ امیر خسرو ایک محب وطن شاعر تھے۔ انھوں نے جہاں اپنی شاعری میں ہندوستانی ماحول اور تہذیب کی ترجمانی کی وہیں وہ ایک صوفی شاعر بھی تھے ان کی تعلیمات کی جتنی اُس عہد میں ضرورت تھی اتنی ہی آج بھی ہے۔

سیمینار کے افتتاحی اجلاس میں جناب ایچ کے دوا نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ امیر خسرو نے اردو زبان کے ابتدائی خدو خال کو سنوارنے اور موسیقی کو بڑھاوا دینے میں جو خدمات انجام دیں اور ہندوستانی تہذیب کو جس طرح گلے لگایا اسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اس موقعے پر گورنر موصوف نے ہریانہ کے ادیبوں کو ان کی کتابوں پر سات سات ہزار روپے کے انعامات اور توصیفی اسناد سے بھی نوازا۔ پروفیسر قمر رئیس کو ان کی کتاب ''بادنو بہار'' جناب مکند لال گپتا صادق فتح پوری کو ان کی کتاب ''رنگ زار'' ڈاکٹر محمد حبیب کو ان کی کتاب ''علاقۂ میوات کا تہذیبی اور سماجی مطالعہ''، پی ڈی کالیہ ہمدم کو ''درِ نایاب'' اور جناب کیدارناتھ شرما کو افسانوی مجموعے ''افسانے پیارے پیارے'' پر انعامات دیے گئے۔ افتتاحی تقریب کے اختتام پر چنڈی گڑھ دوردرشن کے ڈائرکٹر جناب اشرف ساحل نے شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

اس سے قبل ہریانہ اردو اکادمی کے سکریٹری جناب کشمیری لال ذاکر نے اپنی استقبالیہ تقریر میں کہا کہ امیر خسرو کی شخصیت اس قدر ہمہ جہت تھی کہ ان میں ایک شاعر، صوفی، موسیقار اور سب سے بڑھ کر انسانیت کا رنگ شامل تھا۔ انھیں اپنے وطن سے بے پناہ محبت تھی۔ انھوں نے شاعری میں مختلف اصناف کا اضافہ کیا۔ برج، فارسی، عربی، ترکی اور ہندوی زبانوں کے میل سے انھوں نے جو بھی لکھا اس کی آج بھی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی اس دور میں تھی۔

سیمینار کے دوسرے دن امیر خسرو کی شخصیت اور ان کی خدمات پر مقالات پڑھے گئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت جناب غلام نبی خیال نے کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر چندر شیکھر نے ادا کیے۔ اس میں ڈاکٹر دلیس راج سپرا، ڈاکٹر نصیرالدین ازہر اور ڈاکٹر میرا گوتم نے مقالات پیش کیے، دوسرے اجلاس کی مجلس صدارت میں ڈاکٹر صادق، ڈاکٹر خلیق انجم اور پروفیسر شریف حسین قاسمی شامل تھے اور اپرنا شرما، شاہد ماہلی، ڈاکٹر چندر شیکھر نے اپنے مقالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی نظامت شمس تبریزی نے کی۔

تیسرے اجلاس میں شاہینہ تبسم، ڈاکٹر صادق، غلام نبی خیال اور پروفیسر شریف حسین قاسمی نے مقالات پیش کیے۔ صدارت ڈاکٹر چندر شیکھر، شاہد ماہلی اور میرا گوتم اور نظامت ڈاکٹر نصیرالدین ازہر نے کی۔

اختتامی اجلاس کی مجلس صدارت میں جناب آر کے تلیجا ڈاکٹر چندر شیکھر، شری پنکج ایڈیٹر نیشنل بک ٹرسٹ آف انڈیا شامل تھے۔ آخر میں جناب غلام نبی خیال نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

رضا لائبریری میں امیر خسرو پر خطبات

● رام پور، 26 جون۔ رضا لائبریری میں امیر خسرو کی وطن دوستی اور ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میں صوفیوں کا حصہ پر دو لیکچر ڈاکٹر شاہ عبدالسلام کی صدارت میں ہوئے۔ ڈاکٹر وقار الحسن صدیقی او.ایس.ڈی. نے بتایا کہ ملک میں اتحاد اور یک جہتی قائم رکھنے کی غرض سے یہ لیکچر کرائے جارہے ہیں۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی نے امیر خسرو کی وطن دوستی پر اپنے مقالے میں کہا کہ خسرو واحد ہندوستانی فارسی شاعر ہیں جنھیں تمام دنیا میں شہرت ملی۔ پروفیسر قاسمی نے بتایا کہ امیر خسرو نے الگ سے ہندوستان کی عظمت پر کوئی کتاب نہیں لکھی لیکن اپنی مثنوی میں جابجا ہندوستان کی تعریف کرتے نظر آتے ہیں۔

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی نے اپنے مقالے ''ہندوستان کی مشترکہ تہذیب میں صوفیوں کا حصہ'' میں اس خیال کا اظہار کیا کہ صوفیا کے یہاں مذہبی ہم آہنگی کے ساتھ ساتھ وسیع النظری پائی جاتی ہے۔ انھوں نے بتایا کہ صوفیوں نے قرآن و حدیث کی تعلیم پر زیادہ زور دیا اور یوگا کو بھی اپنایا اور ''امرت کنڈ'' کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ وہ خانقاہوں میں رہتے اور خدمت خلق کرتے تھے۔ ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے بھی جلسے سے خطاب کیا۔ آخر میں ڈاکٹر ابوسعد اصلاحی نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ (راشٹریہ سہارا، دہلی)

اردو کے لیے ''بینکنگ لوک پال'' کے اقدام کا خیر مقدم

● الہ آباد۔ ریزرو بینک آف انڈیا کے اتر پردیش اور اترانچل بینکنگ لوک پال نے ادبی تنظیم اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے ایک ممبر ڈاکٹر ضیاء الحق کی اردو میں لکھی گئی اس شکایتی درخواست پر 14 دن کے اندر برانچ منیجر ''وجیا بینک'' الہ آباد سے تفصیلی وضاحت طلب کی ہے، جس میں یہ شکایت و مطالبہ کیا گیا تھا کہ وجیا بینک میں کھاتہ کھولنے اور دیگر فارم، چیک بک اور پاس بک وغیرہ اتر پردیش کی علاقائی زبان یعنی دوسری سرکاری زبان اردو میں بھی مہیا کرائے جانے کے ساتھ ہی بینک میں اردو مترجم کی تقرری کی جائے کیونکہ وجیا بینک میں اردو تعلیم یافتہ ملازم نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکٹر ضیاء

الحق کے اردو میں کاٹے گئے دوسو روپے کے چیک کی ادائگی چار سو روپے کردی گئی۔

اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے بانی بحر العلوم اور قومی صدر محمد اختر چوڑی والا نے بینکنگ لوک پال کے مذکورہ بالا قدم کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ اگر محمد الیاس صاحب بینکنگ لوک پال کے اسسٹنٹ سکریٹری نہ ہوتے تو ڈاکٹر ضیاء الحق کی اردو میں لکھی گئی شکایتی درخواست کوڑے دان میں چلی گئی ہوتی۔ لیکن کیا اب الیاس صاحب اس سوال کا جواب دیں گے کہ ان کی تقرری اردو علم کی بنا پر کی گئی ہے؟ اگر نہیں تو انھوں نے اس درخواست کو کیوں پڑھا اور ایکشن لیا اور اگر لے بھی لیا ہے تو قانون اردو یعنی اتر پردیش آفیشیل لینگویج (امینڈمنٹ) ایکٹ 1989 کے مطابق ڈاکٹر ضیاء الحق کی اردو میں لکھی گئی درخواست کا جواب اردو میں کیوں نہیں دیا۔ کیونکہ تنظیم کا ماننا ہے کہ مرکزی حکومت کا جو بھی محکمہ ریاست اتر پردیش میں کام کرے گا اسے اس ریاست کی دونوں سرکاری زبان کے قانون پر عمل کرنا پڑے گا۔ جب ریزرو بینک آف انڈیا تمام بینکوں کو تین سال قبل ہدایت دے چکا ہے کہ وہ اپنے اپنے بینک میں اردو تعلیم یافتہ عملے کی تقرری کرے تو ہندوستان کا کوئی بھی بینک آر. بی. آئی. کی اس ہدایت پر عمل کیوں نہیں کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں مختلف بینکوں کو تنظیم کی طرف سے شکایتیں بھیجی جا چکی ہیں مگر اب تک کسی کے بھی خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی اور ریزرو بینک آف انڈیا خاموش تماشائی بنا ہوا ہے۔ (ڈاک سے)

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کیمپس پلیسمنٹ سیل کے تحت سات ایم. بی. اے. طلبہ کو ملازمت

● حیدر آباد، 5 جون۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کے کیمپس پلیسمنٹ سیل (Campus Placement Cell) نے یونیورسٹی میں روایتی طرز تعلیم کے تحت ایم. بی. اے. کی تکمیل کرنے والے پہلے بیچ کے سات طلبہ کو ان کے اپنے کورس کی تکمیل کے ساتھ ہی مختلف اداروں میں ملازمت فراہم کرتے ہوئے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو ذریعۂ تعلیم کے طلبہ کا مستقبل بھی دیگر زبانوں کے طلبہ کی طرح روشن اور تابناک ہے۔ وائس چانسلر پروفیسر اے. ایم. پٹھان نے ان طلبہ کے تقرر پر مبارکباد دیتے ہوئے دلی مسرت کا اظہار کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ محنت و جستجو ہی زندگی کے کسی بھی شعبے میں کامیابی و کامرانی کی کلید ہوتی ہے۔ انھوں نے اس یقین کا اظہار کیا کہ ایم. بی. اے. کے طلبہ کی اس شاندار کارکردگی سے یونیورسٹی کے دیگر طلبہ میں بھی ایک جوش اور حوصلہ پیدا ہوگا، اور وہ بھی احساس کمتری سے نکلتے ہوئے کامیابی کے سفر پر رواں دواں ہوں گے۔ انچارج صدر شعبۂ بزنس مینجمنٹ ڈاکٹر ایم اے عظیم کے مطابق یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں کیمپس پلیسمنٹ سیل کے تحت منعقدہ انٹرویو میں مورپن لیباریٹریز لمیٹیڈ میں عمران بیگ کا بحیثیت ایریا بزنس منیجر (اے پی)، ہنی بی اپلائنسز اینڈ الکٹرانکس پرائیویٹ لمیٹیڈ (Honebee Appliances & Electronics Pvt. Ltd.) میں سید امتیاز حسین کا بحیثیت اسسٹنٹ منیجر، مارکٹنگ تقرر ہوا ہے جب کہ محمد فیروز، شیخ احمد، واصل محی الدین اور انور حسین اسی ادارے کے لیے مارکیٹنگ ایگزیکیٹو منتخب ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مارس فائر اینڈ سکیوریٹی سروسز پرائیویٹ لمیٹیڈ نے امتیاز الدین اور ایم اے متین کا علی الترتیب مارکیٹنگ ایگزیکیٹو اور فینانس ایگزیکیٹو کی حیثیت سے تقرر کیا ہے جب کہ ایچ ڈی ایف سی بینک حیدر آباد نے ایم اے حنان جاوید کو مارکٹنگ ایگزیکیٹو مقرر کیا ہے۔ (ڈاک سے)

اقلیتی طلبہ کے لیے مسابقتی امتحانات کی کوچنگ

● حیدر آباد، 20 جون۔ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کی جانب سے اقلیتی طبقات کے طلبہ کو سول سروس اور دیگر مسابقتی امتحانات کی کوچنگ کی منظوری دے دی ہے۔ وائس چانسلر پروفیسر اے. ایم. پٹھان نے ان کوچنگ کلاسوں کے لائحہ عمل کو قطعیت دینے کے لیے طلب کردہ مجلس مشاورت کے اجلاس سے خطاب کے دوران یہ اطلاع دی۔ انھوں نے کہا کہ فی الحال یونیورسٹی کی جانب سے ڈسٹرکٹ سلکشن کمیٹی کے لیے کوچنگ دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے لیکن اس کے علاوہ داخلی شعبے کے تحت مختلف محکموں میں تقررات کے علاوہ دیگر مسابقتی امتحانات کے لیے بھی یونیورسٹی کی جانب سے کوچنگ کلاسوں کا انعقاد کیا جائے گا۔ اس جلسے میں آئی. اے. ایس، آئی. پی. ایس، آئی. ایف. ایس اور آئی. آر. ایس وغیرہ مرکزی سروسوں کے لیے کوچنگ کے علاوہ طلبہ کی شخصیت سازی، عام معلومات، انگریزی اور ریاضی کے مضامین کے ساتھ ان کی ذہنی صلاحیتوں کو بھی اُجاگر کرنے کی تربیت پر خصوصی توجہ دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ پروفیسر سی ستبا راؤ، سابق صدر نشیں (اے پی ایس سی ایچ ای)، پروفیسر یوسف کمال، سابق پروفیسر جیالوجی (عثمانیہ)، جناب ایم اے قدوس، ایڈیشنل سکریٹری، ڈپارٹمنٹ آف ہائر ایجوکیشن، حکومت آندھرا پردیش، پروفیسر کے آر اقبال احمد، صدر شعبہ و ڈائرکٹر فاصلاتی نظام تعلیم، جناب سی ایچ ساجیا، کنسلٹنٹ اکیڈیمک اور ڈاکٹر شہید خاں، اسسٹنٹ ڈائرکٹر اور کوآرڈینٹر نے اس اجلاس میں شرکت کی۔ (ڈاک سے)

قبل ''معلم اردو'' سند یافتگان کو اردو استاد کی پوسٹ پر تقرری کا عدالت کا فیصلہ

● الہ آباد۔ اتر پردیش اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن نے عدالت عالیہ کے اس فیصلے کا خیر مقدم کیا ہے، جس میں عزت مآب جسٹس ترون اگروال نے کہا کہ چونکہ مخالف فریقین یعنی اتر پردیش حکومت نے مختلف ہدایات کے باوجود آج تک اپنا جوابی حلف نامہ داخل نہیں کیا، لہٰذا اس رٹ پٹیشن کو پچھلی عدالت کے ذریعے دیے گئے 1999 کے فیصلے کی روشنی میں Allowed کیا جاتا ہے۔ یہ مقدمہ معراج بی اور دو دیگر مدعیان کے ذریعے داخل کیا گیا تھا، جس پر بحث کرتے ہوئے مدعی کے وکیل منصور احمد نے کہا کہ یہ مقدمہ عدالت عالیہ کے ذریعہ دیے گئے 1999 کے فیصلے سے کورڈ ہے اور عدالت فیصلہ دے چکی ہے 6 اگست 1997 سے قبل ''معلم اردو'' سند یافتگان کو اردو استاد کی اسامی پر تقرری دی جائے۔

فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہوئے اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے بانی بحر العلوم اور قومی صدر محمد اختر چوڑی والا نے کہا کہ معراج بی اور دیگر نے اپنے مقدمے میں پہلا مطالبہ یہ کیا تھا کہ انھوں نے 1996 میں معلم اردو کی سند حاصل کی ہے لہٰذا اسسٹنٹ ٹیچر اردو کی پوسٹ پر تقرری کے لیے ان کی درخواست پر سب سے پہلے غور کیا جائے اور دوسرا مطالبہ یہ کیا تھا کہ حکومت نے 22 مئی 2005 کے اشتہار کے ذریعے بی.ٹی.سی. اردو خاص ٹریننگ کے لیے جو 3000 اسامیاں نکالی ہیں اور حکم نامہ مورخہ 18 نومبر 2005 کے ذریعے منتخب امیدواروں کی جو فہرست تیار کرنے جا رہی ہے، اس کو حتمی شکل نہ دی جائے جب تک کہ موجودہ خالی اردو ٹیچر کی اسامیوں پر مدعیان کی تقرری نہیں ہو جاتی۔

دونوں عہدیداروں نے اگست 1997 سے قبل پاس شدہ معلم اردو سند یافتگان سے اپیل کی ہے کہ وہ اپنا حق حاصل کرنے کے لیے عدالت عالیہ سے رجوع کریں کیونکہ حکومت اعلان کر چکی ہے کہ اس نے دو سال میں 8000 اردو اساتذہ کی اسامیاں منظور کی ہیں جو خالی پڑی ہوئی ہیں لہٰذا تمام معلم اردو سند یافتگان کو ملازمت ملنی چاہیے۔ کیوں کہ یہ بی.ٹی.سی. اردو کے مساوی ہے۔ (ڈاک سے)

شہریار کی سالگرہ پر تہنیتی تقریب

● حیدر آباد، 2 جولائی۔ ایوان اردو میں ممتاز شاعر شہریار کی سترویں سالگرہ کے سلسلے میں تہنیتی تقریب منعقد ہوئی جس کا اہتمام ادارۂ ادبیات اردو، انجمن ترقی اردو، انجمن ترقی پسند مصنفین، حیدرآباد لٹریری فورم، حیدر آباد اکیڈمی، ادارۂ الانصار، فرحت اللہ بیگ اکیڈمی اور ادارۂ شعر و حکمت نے کیا تھا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر سید سراج الدین نے کی اور نظامت کے فرائض علی ظہیر نے انجام دیے۔ مصحف اقبال توصیفی نے شہریار کی نظموں اور غزلوں کے حوالے سے کہا کہ شہریار دھیمے لہجے میں مختصر بات کہتے ہیں جو طویل پرشور آواز کے درمیان بھی سنی جا سکتی ہے۔ مظہر مہدی نے کہا کہ اگر شہریار کی نصف صدی پر محیط شاعری کا جائزہ لیا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ ان کی نظمیں پُر تاثیر اور گہرے احساسات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی غزلوں میں کلاسکی رچاؤ اور دل آویزی ہے۔ انھوں نے مزید کہا کہ جو لوگ جدیدیت میں ابہام کی بات کرتے ہیں انھیں شہریار کی نظموں کا مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ انھیں احساس ہو کہ غلط مفروضے کو کلیہ بنا دینا کتنی بڑی غلط فہمی ہے۔

حسن فرخ نے کہا کہ شہریار کی شخصیت میں استعجاب اور شاعری میں تحیر ہی وہ بنیادی سبب ہے جس نے ان کی امیج ایک رومانی شاعر کے طور پر بنائی ہے۔ علی ظہیر نے کہا کہ اردو شاعری میں دو طرح کے اسلوب دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک تو میر کا انداز ہے جس کو اختیار کر کے پنپنا آسان بات نہیں۔ آج کے شاعروں میں میر تقی میر کا تتبع ناصر کاظمی کے کلام میں ملتا ہے۔ دوسرا اسلوب سودا کا ہے جس سے فیض اور شہریار بھی متاثر ہیں۔

اس موقعے پر ممتاز مزاح نگار مجتبیٰ حسین نے کہا کہ شہریار سے ان کی دوستی کی ابتدا 1972 میں ہوئی جب وہ بہ سلسلۂ ملازمت دہلی میں مقیم تھے اور آئے دن حسن عسکری اور وحید اختر سے ملنے کے لیے علی گڑھ جایا کرتے تھے۔ یہیں وہ شہریار سے ملے اور دونوں میں ایسا تعلق خاطر پیدا ہوا کہ اس کے بعد وہ شہریار کی خاطر علی گڑھ زیادہ جانے لگے۔ شہریار بھی دہلی آتے تو مجتبیٰ حسین کے ساتھ ہی رہتے۔ مجتبیٰ حسین نے اپنے مخصوص انداز میں کہا کہ شہریار کی شاعری میں آسان سوالات بہت ہوتے ہیں جس کے جوابات مشکل ہوتے ہیں۔ مثلاً ''اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے۔''

پروفیسر مغنی تبسم نے شہریار سے اپنی جذباتی وابستگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اگر ان کو اور شہریار کو ایک جان دو قالب کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے شہریار کی شاعرانہ صلاحیتوں کو پروان چڑھانے میں اہم حصہ ادا کیا۔ اعظمی صاحب کی وفات کے بعد وہ مغنی صاحب سے قریب ہو گئے۔ علی گڑھ کی ایک محفل میں دونوں نے مل کر سہ ماہی رسالہ ''شعر و حکمت'' جاری کرنے کے بارے میں سوچا۔ شعر و حکمت پر اب تک تین دور گزر چکے ہیں۔ پہلے دور میں سات شمارے نکلے تھے جن میں آخری شمارہ ن.م. راشد پر نکلا تھا جو اتنا وقیع تھا کہ خود راشد صاحب نے اسے پسند کیا تھا۔

بعض لوگ حیرت کرتے ہیں کہ شہریار علی گڑھ میں رہتے ہیں اور شعر و حکمت حیدر آباد سے نکلتا ہے۔ مغنی صاحب نے بتایا کہ شہریار سے فون پر مشاورت ہوتی ہے۔ وہ پاکستانی ادیبوں شاعروں کی تخلیقات حاصل کرتے ہیں اور شعر و حکمت کے لیے روانہ کرتے ہیں۔ اشتہارات کی فراہمی کے لیے بھی وہ اپنا رسوخ استعمال کرتے ہیں۔

پروفیسر سید سراج الدین نے کہا کہ ایسی سالگرہیں کم دیکھنے میں آتی ہیں جن میں اصل شخص ہی موجود نہ ہو اور اس کے چاہنے والے اس کے غیاب میں اسے یاد کریں۔ انھوں نے کہا کہ شہریار نے دو باتیں بڑے پتے کی کہی ہیں۔ پہلی تو یہ کہ نقاد کو شاعری نے رد کر دیا اور دوسری یہ کہ ادب کسی قلعے سے نہیں کھلتا۔ شہریار کا لہجہ دھیما ہے۔ ان میں سرشاری ہے بے خودی نہیں ہے۔ شہریار کے مزاج اور شاعری میں توازن ہے۔

جلسے کے آخر میں غزل گلوکار جسبیر کور نے اپنی مترنم آواز میں شہریار کی غزلیں ''زندگی روز نئے رنگ بدلتی کیوں ہے''، ''جستجو جس کی تھی اس کو تو نہ پایا ہم نے''، ''کشتیِ جاں سے اتر جانے کو جی چاہتا ہے'' سنا کر سماں باندھ دیا۔

(ڈاک سے)

مجروح سلطانپوری کی یاد میں جلسہ

● پونے، 24 مئی۔ مجروح سلطانپوری کے یوم وصال پر اپنا فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام اور مجروح میموریل سوسائٹی، جلگاؤں کے تعاون سے ''ذکر مجروح'' کے عنوان سے ایک ادبی نشست کا انعقاد منور پیر بھائی (چیئرمین، حاجی غلام محمد اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونے) کی صدارت میں کیا گیا۔ اس موقعے پر مہمانِ خصوصی رفیق جعفر نے مجروح صاحب کی اصول پسندی، حق گوئی اور کسی حد تک انانیت اور ان کے ساتھ گزارے ہوئے یادگار لمحوں کو دلکش انداز میں بیان کیا۔

قاضی مشتاق نے کہا کہ تین ہزار فلمی نغموں کے خالق مجروح نے اردو زبان کو جو فروغ عطا کیا اس کی مثال ملنی مشکل ہے۔ منور پیر بھائی نے کہا کہ شہنشاہِ غزل نے ترقی پسند شاعری کو نئی سمت اور نئی جہت سے روشناس کیا۔ وجد آور شاعری، نغموں کی نفاست، نزاکت اور معنی خیزی نے انھیں عوام و خواص کا مقبول شاعر بنا دیا تھا۔ اس موقعے پر مجروح میموریل سوسائٹی کے صدر ڈاکٹر شفیق ناظم نے بھی ایک مقالہ پیش کیا۔ آخر میں محترمہ ممتاز پیر بھائی نے مجروح کی مشہور زمانہ غزل ''ہم ہیں متاعِ کوچہ و بازار کی طرح'' اپنی مترنم آواز میں پیش کی۔

(ڈاک سے)

منور رانا کے اعزاز میں جلسہ

● میرٹھ۔ چودھری چرن سنگھ یونی ورسٹی کے شعبۂ اردو میں بزمِ اردو کی جانب سے اردو کے ممتاز شاعر منور رانا کے اعزاز میں ایک نشست کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت یونی ورسٹی کے ڈپٹی لائبریرین جمال احمد صدیقی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ منور رانا کی شاعری میں زندگی کی جھلک صاف دکھائی دیتی ہے۔ صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ جدید غزل منور رانا کی تخلیقات کے بغیر ادھوری ہے، سادگی ان کی شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس موقعے پر منور رانا نے اپنی چند غزلیں پیش کیں۔

اس نشست میں ڈاکٹر مشتاق صدف، ذیشان احمد، مشتاق سیفی، حلیم سیفی، فخری میرٹھی، مظفر الدین احمد، منوج کمار مشرا، ظفر گلزار، سید اطہر الدین، فرقان سردھنوی، کے علاوہ کافی تعداد میں سامعین موجود تھے۔ پروگرام کی نظامت عابد علی کامل نے کی اور ڈاکٹر کہکشاں لطیف نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔

(ڈاک سے)

ادبی جلسہ

● لکھنؤ، 3 مئی۔ اتر پردیش اردو اکادمی میں رہبر جونپوری کی آمد پر ان کی حالیہ تصنیف ''پیغامِ حق'' جو تاریخ اسلام کے موضوع پر ساٹھ ابواب پر مشتمل ہے اور جسے انھوں نے آلھا کی بحر میں منظوم کیا ہے، پر ایک ادبی نشست ہوئی جس کی صدارت اکادمی کے صدر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی۔ انھوں نے بتایا کہ رہبر جونپوری نے تاریخ اسلام کو نظم کرنے کے لیے آلھا کی صنف اس لیے اختیار کی تاکہ پڑھنے والے جب اسے عام اجتماع میں پڑھیں تو پھر تاریخ اسلام کے مد و جزر سے پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ ساتھ وہ عوام بھی واقف ہو جائیں جن کا رشتہ اردو زبان سے منقطع ہوتا چلا جا رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ عوامی نظم ہونے کے باعث آلھا کھنڈ کی بدلی ہوئی صورتیں کھڑی بولی، قنوجی، اودھی، بھوجپوری اور مگدھی میں ملتی ہیں اور آج بھی یہ صنف شمالی ہندوستان کے قصباتی علاقوں میں عوامی جذب و شوق کو آسودہ کرتی ہے۔

رہبر جونپوری نے کہا کہ میں نے تاریخ اسلام کو نظم کرنے کے لیے آلھا کی صنف اس لیے اختیار کی کہ اس کا پیرایۂ اظہار، دل آویز ہونے کے ساتھ ساتھ یہ آسان زبان میں بھی ہے اور اسی لیے میں نے بندیلی آلھا کا اسلوب اختیار کیا کیونکہ یہ زیادہ مترنم اور رواں ہے۔ اس کی طرز اور بحر بندیلی آلھا ہے لیکن زبان اردو ہے۔ اس کتاب کا کینوس حضرت آدم سے لے کر نبی کریم ؐ کے آخری خطبے تک پھیلا ہوا ہے۔ اس نشست میں بزم ادب، لکھنؤ کے صدر

وسیم حیدر، مشہور افسانہ نگار نسیم بن آسی، ہاشم علی ہاشم، ڈاکٹر رؤف صدیقی، ڈاکٹر فرقان علی سلمانی، الحاج ڈاکٹر سعید احمد سندیلوی، یونس رحمانی الہ آبادی، نجے کمار مشر اشوق، محقیل فاروقی، جموں یونیورسٹی کے ریسرچ اسکالر علی محمد نے بھی اظہار خیال کیا۔ (ڈاک سے)

بلونت سنگھ کے ناول ''رات، چور اور چاند'' پر سیریل

● نئی دہلی، 20 جون۔ ہندوستانی کلاسیکی ادب کو ساری دنیا میں پہنچانے کے لیے پرسار بھارتی بورڈ نے ایک بڑا قدم اٹھایا ہے اور ہندوستان کی تمام بڑی زبانیں اور ان زبانوں کے ادب پر سیریل اور فلمیں بنانے کا کام شروع کیا ہے۔ دور درشن کے ترجمان کے مطابق، یہ سیریل دنیا کی ہر بڑی زبان میں ترجمے کے بعد مختلف ممالک میں بھی دکھائے جائیں گے——اردو سے متعلق کلاسکس کے لیے ابتدائی دور میں دور درشن نے مظفر علی، سا[illegible] رحدی اور مشرف علام ذوقی کے نام کا انتخاب کیا ہے۔

مشرف عالم ذوقی نے ابھی حال میں بلونت سنگھ کے مشہور ناول ''رات، چور اور چاند'' کی شوٹنگ پوری کی ہے۔ یہ سیریل بہت جلد اتوار کے روز صبح گیارہ بجے دکھایا جائے گا۔ اس کی ہدایت ارون گپتا کی ہے۔ کیمرہ مین پردیپ شریواستو تھے۔ اس میں راجیو ورما، ابیر چودھری، سنجیو، مونیکا وغیرہ نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔

ذوقی اس سے پہلے بھی ''تلاش''، ''مورچہ''، ''دوسرا رخ''، ''کتابوں کے رنگ''، ''بے جڑ کے پودے'' جیسے سیریل بنا چکے ہیں۔ ذوقی کے مطابق اچھا سیریل بنانا، اچھا فکشن لکھنے سے کم نہیں۔ ''رات چور اور چاند'' جیسے ناول پر سیریل بنانا اس لیے بھی مشکل مرحلہ ہے کہ لوگ ناول میں پیش آنے والے واقعات کو اسی طرح سے دیکھنا چاہیں گے، جس طرح پڑھتے ہوئے انھوں نے اپنے دماغ میں نقش کر رکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ذوقی اپنے اس تجربے کو کامیاب بتاتے ہوئے کہتے ہیں، کہ ہم نے ناول سے زیادہ چھیڑ چھاڑ کی کوشش نہیں کی بلکہ ناول کے مجموعی خیال کو ہی سمجھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے۔

(ڈاک سے)

پنجاب سرکار کی جانب سے اردو اکادمی کے قیام کے لیے ایک کروڑ روپے کی گرانٹ

● چنڈی گڑھ، 10 جولائی۔ پنجاب سرکار نے ریاست کے مالیر کوٹلہ میں اردو اکادمی قائم کرنے کے لیے ایک کروڑ روپے دیے ہیں۔ نائب وزیر اعلیٰ راجندر کور بھٹل نے پارلیمانی سکریٹری رضیہ سلطانہ کو ایک کروڑ روپے کا چیک دیا۔ نائب وزیر اعلیٰ نے اردو اکادمی کی عمارت کی تعمیر کی نگرانی کے لیے ایک کمیٹی بنانے کی ہدایت دی ہے کہ اس کی تعمیر جلد از جلد ہو سکے۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

مغربی بنگال اردو اکادمی کے انعامات

● کولکاتہ، 8 جون۔ 2003 کی مطبوعہ اردو کتابوں پر مغربی بنگال اردو اکادمی نے ملک گیر پیمانے پر مندرجۂ ذیل انعامات کا اعلان کیا ہے۔ پانچ ہزار روپے کے انعامات ''سرگوشیاں زمانوں کی'' عبد الاحد ساز اور ''اردو صحافت بہار میں'' ڈاکٹر سید احمد قادری تین ہزار روپے کے انعامات ''بند مٹھی کا بھرم'' ڈاکٹر محبوب راہی اور ''آگہی گرہیں'' کلیم حاذق دو ہزار روپے کے انعامات ''ارمغان رباعیات کندن'' کندن لال کندن اور ''اسلحے، سکے اور ڈاک ٹکٹ میں اسلامیات، تحقیق و تجزیہ'' واحد نظیر کو دیا گیا ہے جب کہ مغربی بنگال کی سطح پر 2003 کی مطبوعہ کتابوں پر پانچ ہزار روپے کا انعام ''خشک ٹہنی زرد پتے'' پروفیسر یوسف تقی، تین ہزار روپے کے انعامات ''چراغ رہ گزر'' ظہیر انور، ''اختر الایمان: تفہیم و تشخص'' ڈاکٹر خواجہ نسیم اختر، دو ہزار روپے کے انعامات ''علقمہ شبلی خوابوں کا صورت گر'' مرتبین راشد انور راشد، جاوید ہمایوں ''خدوخال'' پروفیسر اعزاز افضل، ''بھیگی پلکیں'' ڈاکٹر عابد ضمیر کو ملا ہے۔

2003 میں کثیر تعداد میں معیاری، علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت پر دو ہزار روپے کا انعام ''اثبات و نفی پبلیکیشنز کو اور نفیس طباعت پر ایک ہزار روپے کے انعامات کتاب ''چلتے چلتے'' پر گلستاں پبلیکیشنز، کولکاتہ کو اور ''حنا بن گئی غزل'' پر ایڈشاٹ پبلیکیشنز، کو دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔

سال 2004 کے لیے پانچ ہزار روپے کے انعامات ''سحر سے پہلے'' (حنیف کیفی) اور ''فرہنگ کلام مومن'' ڈاکٹر سلمان راغب کو تین ہزار روپے کے انعامات ''آگ مصروف ہے'' (مظفر حنفی)، ''اقبال اور جدید شاعری'' (ڈاکٹر پریمی رومانی) اور ''پیاری پیاری کہانیاں'' (ڈاکٹر شیخ رحمن اکولوی) کو دو ہزار روپے کے انعامات ''اگنی پریکشا'' (کشمیری لال ذاکر) ''رسالہ جامعہ کا تنقیدی اشاریہ 47-1923 (فرزانہ خلیل) ''گلشن گلشن پھول کھلے'' (شجاع الدین شاہد) اور ''نئی پھلواڑی'' (ڈاکٹر محبوب راہی) کو اور ڈیڑھ ہزار روپے کا انعام ''دھنک کے رنگ'' عزیز اللہ خان عزیز کو دیا گیا ہے۔

مغربی بنگال کی سطح پر 2004 کی مطبوعہ کتابوں پر پانچ ہزار روپے کا انعام ''بدر الزماں بدر کلکتوی'' (ڈاکٹر یوسف تقی) تین ہزار روپے کا انعام ''ناشر و تبصرہ'' (رئیس انور) اور دو ہزار روپے کا انعام ''رباعیات پرویز

شاہدی'' (شاہد ساز) کو دیا گیا ہے۔

2004 میں معیاری، علمی و ادبی کتابوں کی اشاعت کے لیے اثبات ونفی پبلیکیشنز کو دو ہزار روپے کا انعام اور نفیس طباعت کے لیے ایک ہزار روپے کے انعامات ''پہلو نہ دکھے گا'' خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ اور'' جب ہم بھی بڑے ہو جائیں گے'' فراغ روہوی کو ملا ہے۔

(ڈاک سے)

مختصرات

● جودھپور، 25 جون۔ حضرت افضل شاہ کے 79 ویں عرس مبارک کے موقعے پر بزم اردو اور درگاہ کمیٹی کی جانب سے ایک مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت راجستھان اردو اکادمی کے سابق وائس چیئر مین اے.ڈی. راہی نے کی۔ مہمان خصوصی امین جودھپوری تھے۔ مشاعرے میں اے.ڈی.راہی، امین جودھپوری، ساغر القادری، پربھو پرکاش سولنکی، شین میم حنیف، سرفراز شاکر، ڈاکٹر نثار راہی، محمد افضل جودھپوری، اشراق الاسلام ماہر، برجیش عنبر، ایم آئی ظاہر، امیش ساحل اور کوشلیا اگروال نے اشعار سنائے۔ آخر میں درگاہ کے متولی سلیم خان مہر نے شکریہ ادا کیا۔ نظامت ڈاکٹر نثار راہی نے کی۔ (ڈاک سے)

● پرتاپ گڑھ، 4 جون۔ ڈاکٹر تابش مہدی کی وطن آمد پر ان کے اعزاز میں ابوالکلام انٹر کالج میں ایک شعری نشست ہوئی جس کا آغاز ڈاکٹر تابش مہدی کی نعت پاک سے ہوا۔ جناب عارف حسین جونپوری نے ڈاکٹر مہدی کے فکر وفن پر مقالہ پڑھا۔ نشست کی صدارت بزرگ شاعر امتیاز الدین خاں نے کی۔ انھوں نے تابش مہدی کی تصنیف '' شفیق جونپوری ایک مطالعہ'' کے حوالے سے ان کی ادبی وتنقیدی حیثیت پر روشنی ڈالی۔ شعرا میں اکرم الہ آبادی، سنیل پربھاکر، پنچھی سوربھ، طلحۃ تابش، آزاد سلطانپوری، ڈاکٹر آفتاب جونپوری، سہیل پرتاپ گڑھی، جام فتح پوری اور ڈاکٹر جلیل نے اپنا کلام پیش کیا۔ نظامت عارف حسین جونپوری نے کی۔ پروگرام کے کنوینر کالج کے اساتذہ کلیم احمد اور اشفاق احمد تھے۔ (ڈاک سے)

● سیتا پور۔ ادبی تنظیم بزم اردو سیتا پور کی جانب سے مقامی مسلم جونیر ہائی اسکول میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس کی صدارت شاعر وصحافی مست حفیظ رحمانی نے اور نظامت ادیب رضوان خاں نے کی۔ مشاعرے میں جن شعرائے کرام نے اپنا کلام پیش کیا ان میں مست حفیظ رحمانی، اشتیاق علی، رضوان خاں، منظر یٰسین، عارف محمد عارف، شکیل ملانوی، عمران سیتاپوری اور خوشتر رحمانی کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ آخر میں ابوذر نعمانی نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

مشاعرے

● نئی دہلی، 2 جولائی۔ ادبی، ثقافتی و فلاحی تنظیم ''نئی آواز'' کی جانب سے ایک شعری محفل معروف صحافی اور معتبر شاعر قیس رامپوری کے اعزاز میں شاہین باغ، جامعہ نگر نئی دہلی میں منعقد کی گئی جس کی صدارت ممتاز شاعر اور ادیب جناب مخمور سعیدی نے کی جب کہ نظامت ''نئی آواز'' کے جنرل سکریٹری اعجاز انصاری نے کی۔ افتتاح بزرگ شاعر صابر ابوہی نے کیا۔ عبدالحق اور بو چودھری اس موقعے پر مہمان خصوصی تھے۔

جناب مخمور سعیدی نے اس موقع پر قیس رامپوری کو شال اوڑھا کر اعزاز عطا کیا۔ جناب مخمور سعیدی نے اس موقعے پر کہا کہ یہ زندہ لوگوں کی پہچان ہے کہ وہ ان کی زندگی میں ان کو پہچان کر ان کی قدر کرتے ہیں۔ مشاعرے کا آغاز وارث وارثی کی نعت پاک سے کیا گیا۔ مشاعرے کے اختتام پر کنوینر عادل رشید تلہری نے مہمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ اس میں مخمور سعیدی، صابر ابوہی، ابرار کرتپوری، قیس رامپوری، فصیح اکمل، شہباز ندیم ضیائی، اعجاز انصاری، کوثر مظہری، شعیب مرزا، عبیدالرحمن، مولا بخش اسیر، عادل رشید تلہری، وارث وارثی، فرمان احمد فرمان اور نسیم مجیدی نے کلام پیش کیا۔

● چنئی۔ چنئی کے راج بھون میں بزم ادب کرشناگری کے زیر اہتمام پہلی بار اردو مشاعرہ ہوا جس کی صدارت گورنر تامل ناڈو عالی جناب سردار سرجیت سنگھ برنالا نے کی۔ جس میں جمیل اختر جمیل بنارسی، نذیر نصرت بنگلوری، انیس ابراہیم بنگلوری، سردار عبد الوہاب دانش بنگلوری، حامد باقری بنگلوری، شاہد مدراسی، حسن فیاض، اصغر ویلوری، ڈاکٹر سید سجاد حسین ظہیر، ڈاکٹر عبید الرحمن احساس، گیان چند مرما گیہ، ڈاکٹر مہیش کار نقش، سمن اگروال، سجاد تجاری، سید رفیق پاشا قادری، ڈاکٹر جمالی، منیر رشیدی، شہر آبرو، ڈاکٹر اعجاز کمال، صبا مصطفےٰ وغیرہ نے اپنا کلام سنایا، مختار بدری نے اس کی منظوم نظامت کی۔

اس موقعے پر گورنر تامل ناڈو نے مختار بدری کو ان کی ادبی خدمات کے لیے ٹرافی پیش کی اور یہ اعلان کیا کہ آئندہ پانچ برسوں تک ہر سال راج بھون میں ایک اردو مشاعرہ منعقد ہوگا۔ (ڈاک سے)

● شاہجہاں پور، 26 جون۔ انجمن شعر و ادب شاہجہاں پور کی جانب سے مدرسہ ثریا ماٹیسری اسکول محلہ دلا زاک میں زیر صدارت معصوم نہوروی اور نظامت ڈاکٹر جاوید نسیمی تقریب ایوارڈ اور مشاعرہ منعقد ہوا۔ مہمان خصوصی کنور جتن پرساد (ممبر پارلیمنٹ) تھے۔ اس موقعے پر کنور جتن پرساد نے

شعری و ادبی خدمات کے لیے ول شاہجہاں پوری مرحوم کے جانشیں نسیم شاہجہاں پوری کو، دینی، ادبی اور سماجی خدمات کے لیے مشہور عالم دین، مولانا قمر شاہجہاں پوری کو اور ضلع میں کل داؤدی کے فروغ اور منصب قاضی شہر کے فرائض کی بحسن وخوبی ادائیگی کے لیے قاضی سید مسعود حسن کو" شان شاہجہاں پور" ایوارڈ عطا کیا۔ اس کے بعد مشاعرہ منعقد ہوا جس میں معصوم نہٹوروی، نسیم شاہجہاں پوری، مولانا قمر شاہجہاں پوری، ڈاکٹر سید رشید حسین اثر، ڈاکٹر جاوید نسیمی، عتیق حسن خاں صبا، وسیم مینائی، ساجد خیر آبادی، عظیم شاہجہاں پوری، عبد القدیر مسرور، اصغر یاسر، ظفر علوی، شوق شاہجہاں پوری، عرش شاہجہاں پوری اور یعقوب ساغر کانپوری نے اپنا کلام سنایا۔ آخر میں مجیب الرحمن خاں ایڈووکیٹ نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

● حیدر آباد، 13 جون۔ 10 جون کی شام نامور فنکار اور آرکٹکٹ جناب کرشنا سوامی، سوامی سکندر آبادی کی صدارت میں سکندر آباد کے جشن دو سو سالہ تقاریب کے موقعے پر ایک مشاعرہ منعقد ہوا جس میں صلاح الدین نیر، نہپال سنگھ ورما، اثر غوری، محسن جلگانوی، اور یوسف یکتا مہمانان خصوصی تھے۔ مشاعرے کی ابتدا میں کنوینر و ناظم مشاعرہ شاغل ادیب نے اپنی افتتاحی تقریر میں بتایا کہ آزادی کے بعد سکندر آباد میں اردو کی بہت ساری انجمنیں قائم ہوئیں جن میں جناب شوق سکندر آبادی کی "بزم اردو ادب" کو اولیت حاصل ہے۔ بعد ازاں محکمہ ریلوے میں وجود میں آنے والی انجمنیں انجمن اردو، ساؤتھ سنٹرل ریلوے اردو اسوسی ایشن (رجسٹرڈ)، اور انجمن ادب کے علاوہ کاروان ادب (رجسٹرڈ)، اردو رائٹرس فورم اور انڈین رائٹرس اینڈ آرٹسٹ اسوسی ایشن کی ادبی سرگرمیوں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ان انجمنوں کے سربراہوں نے سکندر آباد میں اردو کے ماحول کو خوشگوار کرنے میں بے لوث خدمات انجام دی ہیں۔ مشاعرے میں کرشنا سوامی، سوامی سکندر آبادی، صلاح الدین نیر، نہپال سنگھ ورما، اثر غوری، محسن جلگانوی، یوسف یکتا، شاغل ادیب، ڈاکٹر راہی، سلیم عابدی، بصیر افضل، حلیم بابر، ڈاکٹر طیب پاشاہ قادری، نانک سنگھ نشتر، نادر المسدوسی اور مصطفیٰ نیاز نے کلام سنایا۔ (منصف، حیدرآباد)

رسم اجرا

ادب ساز

● نئی دہلی، 25 مئی۔ سہ ماہی "ادب ساز" کی تقریب رسم اجرا کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر خلیق انجم نے کہا کہ اردو کا رسالہ نکالنا ہر زمانے میں ایک ادبی جہاد رہا ہے پھر بھی صحافی مجاہدین کی کوشش اور جدوجہد سے کئی رسالے بہت طویل عرصے سے جاری ہیں مثلاً "رہنمائے تعلیم" دہلی، "شاعر" ممبئی اور انجمن ترقی اردو ہند کے "اردو ادب" اور "ہماری زبان" وغیرہ۔ انھوں نے مزید کہا کہ جس اہتمام سے نصرت ظہیر نے ادب ساز جاری کیا ہے اس سے مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ بہت جلد ادبی صحافت میں ایک اعلیٰ مقام حاصل کرے گا۔" ادب ساز" ایک ایسا رسالہ ہے جو عوام اور خواص دونوں کے لیے اہمیت رکھتا ہے۔ اس میں سید محمد اشرف، حمایت علی شاعر اور امرتا پریتم پر گوشے شائع کیے گئے ہیں۔ ڈاکٹر خلیق انجم نے جناب نصرت ظہیر کو اس رسالے کی اشاعت پر مبارکباد دیتے ہوئے مشورہ دیا کہ وہ ہمت اور حوصلے سے کام لیتے ہوئے رسالے کو جاری رکھیں۔ "ادب ساز" کی رسم اجرا ساہتیہ اکیڈمی کے صدر پروفیسر گوپی چند نارنگ نے انجام دی۔ انھوں نے نصرت ظہیر کو مشورہ دیا کہ "ادب ساز" کے ذریعے بدلتے ہوئے عالمی منظر نامے میں اپنے عہد کے تنقیدی بحث ومباحثے کو آگے بڑھانے کی کوشش کریں۔ نارنگ صاحب نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ گذشتہ تین برسوں میں جن شاعروں اور ادیبوں نے امتیازی حیثیت حاصل کی ہے ان کی تعداد بہت کم ہے۔ اس موقعے پر ممتاز افسانہ نگار سید محمد اشرف سے ملاقات کا اہتمام بھی کیا گیا تھا۔ سید محمد اشرف نے اپنے نئے ناول "مردار خور" کا ایک حصہ پڑھ کر سنایا۔ اس کہانی کے حوالے سے مزید بحث ہوئی جس میں سید محمد اشرف کے علاوہ مشرف عالم ذوقی، انجم بھائی، پروفیسر اختر الواسع اور فرحت احساس نے شرکت کی۔ (ہماری زبان، نئی دہلی)

تجزیات وتعبیرات

● کھنڈوہ۔ معروف شاعر اور ادیب ڈاکٹر محبوب راہی کے نثری مضامین کے اولین مجموعے "تجزیات وتعبیرات" کے اجرا کی تقریب بزم خوشتر کھنڈوہ اور انجمن ترقی اردو شاخ کھنڈوہ کے زیر اشتراک منعقد ہوئی۔ مانک اٹھیری کھنڈوہ میں پرمود جین صوبائی نائب صدر اقلیتی سیل کی صدارت میں بزرگ شاعر قاضی حسن رضا کے ہاتھوں اجرا کی رسم انجام پائی جب کہ مہمانان خصوصی کی حیثیت سے نذیر فتح پوری مدیر "اسباق" پونہ۔ رفیق جعفر، ڈاکٹر امین انعامدار اور اقبال خلش کے علاوہ اجے اوجھا صدر ضلع کانگریس کمیٹی شریک تھے۔ حبیب عالم نے تعارفی تقریر کی۔ رفیق جعفر نے محبوب راہی کی نثری شناخت کے عنوان سے مقالہ اور نذیر فتح پوری نے "ہمارے دور کے محبوب راہی کا سفر دیکھو" کے عنوان سے منظوم خراج عقیدت پیش کیا۔ اس موقعے پر محبوب راہی نے حاضرین جلسہ کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقعے پر نذیر فتح پوری کی صدارت میں ایک کل ہند مشاعرے کا آغاز فہیم احمد برہانپوری اور اقبال خلش کی نعتوں سے ہوا۔ مشاعرے میں نذیر فتح پوری، عاجز ہیاولی، اشفاق ساروی،

رفیق جعفر ممبئی، ڈاکٹر امین انعامدار، دامراؤتی اقبال خلش رکوٹوی، ظہیر انصاری، فہیم امجد، جاوید رعنا اور رشید عنبر، قاضی حسن رضا، ایس۔ ایم جلیس، اظہر الدین اظہر، شیخ عبداللہ شیخ، دلکش کھنڈوی، گوہر انصاری، ہارون فراق، اشفاق مضطر، حبیب سرور، تسلیم شبیر اور قاسم اقبال نے کلام پیش کیا۔ نظامت ڈاکٹر امین انعامدار نے کی۔ گوہر انصاری نے شکریہ ادا کیا۔ (ڈاک سے)

خوش اعجاز

● نئی دہلی، 30 مئی۔ معروف شاعر خالد عبادی کے دوسرے مجموعے 'خوش اعجاز' کا اجرا صحافی و شاعر فرحت احساس اور ادیب مشرف عالم ذوقی نے کیا۔ اس موقعے پر بڑی تعداد میں شعرا، ادبا، صحافی، اساتذہ، علمی، ادبی اور سماجی شخصیات نے شرکت کی جن میں ظفر عدیم، نعمان شوق، ابرار رحمانی، کوثر مظہری، خورشید اکرم، عاقل زیاد، نصیر الدین ازہر، شکیل اختر، اقبال جمیل، افتخار احمد، تابش آفاقی کے نام قابل ذکر ہیں۔ تقریب کی نظامت خورشید اکرم نے کی جب کہ صدارت کے فرائض ظفر عدیم نے انجام دیے۔ اس موقع پر فرحت احساس نے کہا کہ خالد عبادی کی شاعری شدید قسم کی مداخلت انگیز شاعری ہے اور احتجاج اور آمادگی جنگ ان کی شاعری کا غالب عنصر ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے کہا کہ یہ کتاب ان کی تہدار شخصیت کا عکس ہے۔ خالد عبادی نے بازار کے تقاضوں کو شاعری پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ ظفر عدیم نے کہا کہ ان کی شاعری میں حفظ نفس ہے۔ ابرار رحمانی نے بھی خالد عبادی کی شاعری کی خصوصیات اور محاسن کی نشاندہی کی۔ آخر میں خالد عبادی نے کہا کہ اگر میں اب تک کی اپنی شاعری کے باوجود معتوب نہیں ٹھہرایا گیا ہوں تو سمجھنا چاہیے کہ میں نے ابھی تک شاعری شروع ہی نہیں کی۔

(راشٹریہ سہارا، دہلی)

امر کہانیاں

● دانمباڑی، 25 مئی۔ بزم نو کی جانب سے پروفیسر انور کمال کی صدارت میں ایک جلسہ ہوا جس میں جناب محمد یعقوب اسلم کی بچوں کے لیے لکھی گئی کہانیوں کی کتاب ''امر کہانیاں'' کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقعے پر پروفیسر انور کمال نے اردو میں بچوں کے ادب کی ضرورت، اس کی افادیت اور اس سلسلے میں یعقوب اسلم کی خدمات پر روشنی ڈالی۔ (ڈاک سے)

شگفتہ بیانی میری

● سنبھل، 2 جولائی۔ علامہ اقبال ماڈرن پبلک اسکول میں ڈاکٹر رضاء الرحمٰن عاکف سنبھلی کے مزاحیہ مضامین اور تقاریر کے مجموعے ''شگفتہ بیانی میری'' کی رسم اجرا نواب اختر عادل نے انجام دی۔ سابق پرنسپل محمد راشد جلسے کے مہمان خصوصی تھے۔ دلدار دولہا، رفیق راہی، عبدالمجیب صدیقی، ڈاکٹر چمن نے کتاب پر اظہار خیال کیا۔ ڈاکٹر عاکف سنبھلی کی نظموں کے تین مجموعے ''شگوفے''، ''غنچے'' اور ''مہکتی کلیاں'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اس نشست کی نظامت رفیق راہی نے کی۔ (ڈاک سے)

جانے والوں کی یاد

احمد ندیم قاسمی

● لاہور، 10 جولائی۔ معروف شاعر اور ادیب احمد ندیم قاسمی کا 10 جولائی کی صبح لاہور کے ایک اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر 89 برس تھی۔ وہ دل کی تکلیف کے باعث لاہور کے پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیالوجی میں انتہائی نگہداشت والی یونٹ میں داخل تھے۔ احمد ندیم قاسمی کو کافی عرصے سے پھیپھڑوں اور سانس کا عارضہ بھی لاحق تھا لیکن اس بار انھیں دل کی تکلیف کی وجہ سے اسپتال میں داخل کیا گیا۔ آخری وقت میں ان کے صاحبزادے نعمان قاسمی، صاحبزادی ناہید قاسمی اور منہ بولی بیٹی اور ''فنون'' کی شریک مدیرہ منصورہ احمد بھی موجود تھیں۔ 1930 کی دہائی میں ادبی سفر شروع کرنے والے احمد ندیم قاسمی شمال مغربی پنجاب کی وادی سون سکیسر کے گاؤں انگہ ضلع خوشاب میں 20 نومبر 1916 کو پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام احمد شاہ تھا۔ ندیم ان کا تخلص تھا۔ وہ پریم چند کے بعد دیہی ثقافت کو اردو افسانے میں متعارف کرانے والے دوسرے سب سے بڑے ادیب تھے۔ وہ شاعر، ادیب اور ڈراما نویس کے ساتھ ساتھ کالم نگار بھی تھے۔ انھوں نے پنجاب یونیورسٹی سے گریجویشن کیا۔ اس کے بعد پہلے کلرک اور بعد میں صحافت کے شعبے سے وابستہ ہوئے۔ انھوں نے تقریبا 50 کتابیں تصنیف کیں۔ ''جلال و جمال'' ''شعلۂ گل'' اور ''کشتِ وفا'' ان کے شعری مجموعے ہیں اور ''چوپال'' ''سناٹا'' اور ''کپاس کے پھول'' افسانوی مجموعے ہیں۔ قاسمی صاحب نے ''پھول'' ''تہذیب نسواں'' ''ادب لطیف'' ''سویرا'' اور ''نقوش'' جیسے مقتدر رسائل کی ادارتی ذمہ داریاں بھی نبھائیں اور رسالہ ''فنون'' جاری کیا اور گذشتہ 40 برس سے اسے پابندی سے شائع کر رہے تھے۔

قاسمی صاحب نے کئی دہائیوں تک روزنامہ جنگ میں ''رواں دواں'' کے عنوان سے ہفتہ وار کالم بھی لکھا جو کافی پسند کیا گیا۔ قاسمی صاحب کے انتقال سے اردو کے ادبی حلقے میں ماتمی فضا چھا گئی ہے اور ہند و پاک کی

ادبی انجمنیں اور ادارے نیم یونیورسٹیوں اور کالجوں کے مختلف شعبوں میں تعزیتی جلسوں اور مرحوم کے لیے دعائے مغفرت کا سلسلہ جاری ہے۔

ممتاز ادیب اور نقاد جناب شمس الرحمٰن فاروقی (وائس چیئرمین قومی اردو کونسل) نے اپنے تعزیتی پیغام میں کہا ہے کہ احمد ندیم قاسمی کے انتقال کے ساتھ اردو ادب کے ایک شاندار دور کا خاتمہ ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک کے زیر اثر جن غیر معمولی اور دیو قامت تخلیقی اور تنقیدی ذہنوں نے اردو ادب کی آبیاری کی ان میں احمد ندیم قاسمی آخری فرد تھے اور ان کے بعد دور دور تک کوئی ان کا مثیل نظر نہیں آتا۔

احمد ندیم قاسمی بیک وقت اعلیٰ درجے کے افسانہ نگار، شاعر، کالم نگار، اور ن، تھے۔ وہ ایک معروف صحافی تو تھے ہی لیکن ان کے بڑے امتیازات میں سالہ'' فنون'' کا اجرا اور اس کی مسلسل ادارت بھی ہے۔ قاسمی صاحب کے زیر اثر یہ رسالہ بہت جلد نہ صرف اعلیٰ ادب کا ترجمان بن گیا بلکہ وہ مختلف طرز وفکر رکھنے والے ادیبوں اور شاعروں کے لیے بھی اظہار خیال کا میدان بن گیا اور صرف ترقی پسند ادیبوں تک محدود نہ رہا۔ فنون میں قاسمی صاحب نے کئی نامور جدید شعرا اور افسانہ نگاروں کو برابر شائع کیا اور شائع ہی نہیں کیا بلکہ ان کی ناموری کا ذریعہ بھی بنے۔

احمد ندیم قاسمی ایک طویل مدت تک مجلس ترقی ادب لاہور کے ناظم رہے۔ ان کی نگرانی میں اردو کی متعدد بیش بہا اور نایاب کتابیں شائع ہوئیں اور تمام اردو دنیا میں ان کے باعث کلاسیکی ادب میں دلچسپی بڑھی، بہت سی کتابیں اور مخطوطے تو ایسے ہیں کہ مجلس ترقی ادب لاہور کے علاوہ اور کسی نے انھیں شائع ہی نہیں کیا اور احمد ندیم قاسمی نے انھیں شائع اور عام کر کے اردو ادب اردو ادب کے چاہنے والوں پر بہت بڑا احسان کیا۔ احمد ندیم قاسمی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ نئے لکھنے والوں کو پڑھتے اور ان کی ہمت افزائی کرتے تھے چاہے وہ ان کے خیالات سے متفق نہ ہوں۔ وہ ایک انتہائی نفیس، مہذب اور دوست نواز شخص تھے۔ ترقی پسند ادب سے وابستگی کی بنا پر ایک زمانے میں انھیں قید و بند بھی سہنا پڑا لیکن ان کی شخصیت کی مٹھاس اور زبان کی شیرینی یوں ہی باقی رہی اور ان کی تحریر یا تقریر میں کبھی کوئی تلخی یا آشفتگی نہ پیدا ہوئی۔

تمام اردو والے میری اس بات سے متفق ہوں گے کہ احمد ندیم قاسمی کی ادبی میراث ہماری بہت قیمتی میراث ہے اور ان کے جانے کا غم بھلائے نہ بھولے گا۔

خورشید الاسلام

●20 جون، دہلی۔ اردو کے نامور ادیب، دانشور اور شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی کے سابق صدر پروفیسر خورشید الاسلام کی رحلت پر قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین جناب شمس الرحمٰن فاروقی نے انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ خورشید الاسلام صاحب نے اپنی خوبصورت انشا پردازی اور تنقید کے نئے اور تخلیقی طرز کی بنا پر بہت جلد اپنا نام سکۂ رائج الوقت کی طرح ہر طرف قائم کر دیا تھا۔ شبلی پر ان کے مضمون کے بارے میں مولانا آزاد کی تحسینی رائے اور ان کا یہ جملہ کہ ''خورشید الاسلام صاحب نے غیر شعوری طور پر ایک فرانسیسی نقاد کا طرز اختیار کیا ہے'' تمام اردو دنیا میں خورشید صاحب کی قدر اور عزت قائم کرنے میں معاون ہوا۔ خورشید الاسلام نے رالف رسل کے ساتھ مل کر غالب پر یادگار کارنامہ انجام دیا۔ علاوہ ازیں انھوں نے میر، سودا اور میر حسن پر جو کتاب رسل صاحب کے ساتھ لکھی یعنی Three Moghul Poets، اس نے ہمارے ان شعرا کو بیرونی دنیا سے متعارف اور مشہور کرنے کی خدمت انجام دی۔ یہ دونوں کتابیں '' غالب — لائف اینڈ لیٹرس'' اور تھری مغل پوئٹس'' مدت گزر جانے کے بعد بھی مقبول ہیں اور جگہ جگہ پڑھی اور پڑھائی جاتی ہیں۔

خورشید صاحب کو اردو، فارسی اور انگریزی پر مکمل عبور حاصل تھا۔ وہ اردو کے بہت عمدہ شاعر بھی تھے اور انھیں لغت نگاری سے بھی دلچسپی تھی۔ افسوس کہ آخری زمانے کی بہت طویل بیماری نے انھیں بستر سے لگا دیا تھا اور گذشتہ کوئی دو دہائیوں سے وہ بالکل خاموش تھے لیکن اردو ادب میں ان کا نام ہمیشہ باقی رہے گا۔

خورشید الاسلام صاحب کی یاد میں دہلی یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک تعزیتی جلسے کا انعقاد ہوا۔ صدر شعبہ پروفیسر ابن کنول نے مرحوم سے اپنی ذاتی وابستگی اور ان کی ادبی خدمات پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ پروفیسر خورشید الاسلام نہ صرف اردو کے ادیب و دانشور تھے بلکہ ایک اعلیٰ اقدار رکھنے والے انسان تھے۔ وہ اپنے رفقا اور شاگردوں کو بے حد عزیز رکھتے تھے، ان کے ادبی کاموں کو کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ پروفیسر صادق نے کہا کہ پروفیسر خورشید الاسلام بلا شبہ ایک بلند پایہ ناقد و شاعر تھے۔ ان کا پہلا مجموعۂ کلام '' رگ جاں'' تھا، بعد میں انھوں نے نثری نظموں کو اپنے تخلیقی اظہار کا وسیلہ بنا لیا تھا۔ اردو میں جدیدیت کی تحریک اور جدید قلمکاروں کی بھی انھوں

نے بڑی ہمت افزائی کی تھی۔ پروفیسر عبدالحق نے کہا کہ مرحوم اپنے معاصرین میں تنہا شخص تھے جو تخلیق اور تنقید میں یکساں مہارت رکھتے تھے۔ان کی تنقید اور ان کی شاعری کی تہ در تہ خصوصیات ہمارا قیمتی ادبی ورثہ ہیں۔ ڈاکٹر توقیر احمد خاں نے کہا کہ خورشید الاسلام صاحب کی مقبولیت میں ان کی کتاب ''تھری مغل پوئٹس'' کی وجہ سے بے حد اضافہ ہوا۔ ان کا یہ کارنامہ بہ زبان انگریزی ہونے کی بنا پر یورپ اور انگریزی داں حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔

اس موقعے پر صدر شعبۂ فارسی پروفیسر نرگس جہاں، ڈاکٹر ابوشہیم خاں، ڈاکٹر رضوان الحق اور محمد اکمل کے علاوہ شعبے کے دیگر اساتذہ اور طلبہ موجود تھے۔

● لکھنؤ، 21جون۔'' پروفیسر خورشید الاسلام اپنی علمی بصیرت، اپنی تخلیقی تنقید اور اپنے منفرد اسلوب نگارش کی بنا پر اردو کی ادبی تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ وہ صرف ایک محقق اور نثر نگار ہی نہیں تھے بلکہ ان کے شائع شدہ تین مجموعہ ہائے کلام'' شاخِ نہالِ غم''،'' جستہ جستہ'' اور'' رگِ جاں'' نہ صرف ان کی خوش فکری کے غماز ہیں بلکہ اردو شاعری کے تبدیل ہوتے ہوئے رجحانات کے بھی اشارے ہیں۔ ان کے انتقال سے ہم ایک منفرد صاحب اسلوب فنکار سے محروم ہو گئے ہیں۔'' مذکورہ خیالات کا اظہار اتر پردیش اردو اکادمی میں منعقد ہونے والے ایک تعزیتی جلسے میں اکادمی کے صدر پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کیا۔ انھوں نے کہا کہ پروفیسر خورشید الاسلام نے 87برس کی طویل عمر پائی مگر جب تک وہ گوشہ نشیں نہ ہوئے انھوں نے اپنی شخصیت اور تحریروں کی انفرادیت کی چھاپ ہر جگہ چھوڑی۔ انھوں نے لندن یونیورسٹی میں تدریسی فرائض کے ساتھ ساتھ یونیسکو پروجیکٹ کے تحت غالب کے خطوط پر جو تحقیقی کام کیا وہ ہمارے ادب کا ایک معتبر حصہ ہے۔

افضل محمد

● گلبرگہ،8جون۔انجمن ترقی اردو گلبرگہ کے عہدہ داران اور ارکان نے ممتاز ماہر تعلیم پروفیسر افضل محمد سابق وائس چانسلر، بی آر امبیڈکر اوپن یونیورسٹی اور جواہر لال نہرو ٹیکنالوجیکل یونیورسٹی حیدر آباد کے انتقال پر اپنے گہرے رنج و ملال کا اظہار کیا ہے۔ مرحوم کے بھائی ممتاز براڈ کاسٹر احمد جلیس کے گلبرگہ میں قیام کے دوران ہی سے اہل گلبرگہ کا پروفیسر افضل محمد سے تعلق خاطر رہا ہے۔ ان کی اچانک رحلت سے گلبرگہ کے علمی، ادبی و ثقافتی حلقوں میں رنج و غم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ مرحوم کی تعلیمی، ادبی و ثقافتی خدمات نا قابل فراموش ہیں۔

رئیس رام پوری

● رام پور۔ ممتاز شاعر رئیس رام پوری کا 16جون2006 کو بروز جمعہ سہ پہر انتقال ہو گیا۔ رئیس رام پوری کی عمر بوقت انتقال تقریباً 76سال تھی۔ان کا پورا نام رئیس الرحمٰن خاں تھا۔ وہ 1930میں پیدا ہوئے ۔ ان کے والد بے تک رام پوری طنز و مزاح کے بے مثل شاعر تھے۔ رئیس رام پوری کو بچپن سے شعر کہنے اور جوش و جگر کے رو برو مشاعروں میں کلام سنانے کا موقع ملا۔ مرحوم نہ صرف ہندو پاک بلکہ سمندر پار بھی مشاعروں میں دبستان رام پور کی نمائندگی کرتے رہے۔ رئیس رام پوری فن شاعری میں محشر عنایتی کے شاگرد تھے۔ مرحوم کے چار مجموعۂ کلام'' احساس''،'' تاثرات''،'' آئینہ جو آئی'' اور'' یہ میرا وطن ہے'' شائع ہو چکے ہیں۔آپ کے دو مجموعے ہندی رسم الخط میں بھی شائع ہوئے۔

'' روہیلکھنڈ اردو لغت'' اور'' رام پور درپن'' آپ کی یادگار نثری کتابیں ہیں۔ رئیس رام پوری نے ہند و پاک کے شعرا کے منتخب اشعار پر مشتمل ایک مجموعہ'' گجرا'' کے نام سے ہندی میں شائع کرایا اور اپنے والد کا مجموعۂ کلام'' تک بے تک'' کے نام سے بھی مرتب کر کے شائع کرایا۔ رئیس رام پوری کے پسماندگان میں ایک بیوہ کے علاوہ تین لڑکے اور دو لڑکیاں موجود ہیں۔

جمیل احمد

● پٹنہ ۔انجمن ترقی اردو ، بہار کے نائب صدر جمیل احمد ایڈوکیٹ کا طویل علالت کے بعد 15جون کو پٹنہ کے ایک اسپتال میں انتقال ہو گیا۔ ان کی عمر 75سال تھی۔ جمیل احمد گو کہ پیشے سے ایک وکیل تھے لیکن اردو زبان کی محبت ان کے سینے میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ انجمن ترقی اردو بہار کے صدر پروفیسر عبدالمغنی، کارگزار صدر ہارون رشید اور جنرل سکریٹری فخر الدین عارفی نے جمیل احمد کی وفات کو اردو تحریک کا ایک نا قابل تلافی نقصان قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ وہ انجمن کے ایک فعال اور متحرک عہدیدار تھے اور گذشتہ 25برسوں سے وہ انجمن ترقی اردو بہار کے نائب صدر کی حیثیت سے اپنی ذمہ داریاں پوری مستعدی سے نبھا رہے تھے۔

□□□

تبصرہ وتعارف

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (جلد اول)
مصنف: چارلس ڈکنس
مترجم: فضل حسنین
صفحات: 516، قیمت: -/256 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: یوسف ناظم، 19۔الہلال، 13۔باندرہ ریکلیمیشن۔ممبئی 400050

ڈیوڈ کاپر فیلڈ انگریزی زبان کے مایہ ناز ناول نگار چارلس ڈکنس کی فقید المثال تخلیق ہے۔ اس عظیم ناول نگار نے اور بھی شاہکار ناول لکھے ہیں لیکن ڈیوڈ کاپر فیلڈ کی بات ہی کچھ اور ہے اور خاکسار کو یہ کہنے میں کوئی باک نہیں ہے کہ اگر اس شہرۂ آفاق ناول کا ترجمہ اردو زبان میں نہ کیا جاتا تو اردو ادب کے ذخیرے میں ایک تابناک ہیرے کی کمی رہ جاتی۔ چارلس ڈکنس صرف 58 سال زندہ رہا لیکن لازوال شہرت اور عزت اس کے مقدر میں تھی۔ اس شہرت میں زیرنظر ناول کا بھی حصہ ہے۔ اردو داں طبقے کے ان قارئین کو جنھیں اصل ناول پڑھنے کا کسی وجہ سے موقع نہیں مل سکا، خوش ہو جانا چاہیے کہ ناول کا یہ ترجمہ جو فضل حسنین جیسے ہر دو زبانوں پر عبور رکھنے والے مترجم کی محنت شاقہ اور شغف کا نتیجہ ہے، ان کے خسارے کی پوری پوری تلافی کر دے گا۔ زیرنظر ترجمے میں چارلس ڈکنس کے دل کو موہ لینے والے اسلوب کو اردو کے قالب میں پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔ ترجمے کو اصل ناول کا عکس جمیل ماننے کو دل چاہتا ہے۔ ناول کے مترجم نے ''عرض مترجم'' میں جہاں ناول نگار کی ''مشکل اور پیچیدہ زبان'' اور نامانوس محاوروں کا ذکر کرتے ہوئے شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے فاضلانہ مشوروں اور عملی تعاون کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے وہیں اس وقت کے ڈائرکٹر حمید اللہ بھٹ کی بھی اعانت کا شکریہ ادا کرنے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے۔

چارلس ڈکنس کی تحریر کی دلربائی اور اس کے اسلوب کی رعنائی کو اپنے ترجمے میں کشید کرنے میں فاضل مترجم نے کتنا وقت صرف کیا ہوگا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس ترجمے کی ہر سطر میں پھولوں کی وہی خوشبو بسی ہوئی ہے جس سے چارلس ڈکنس کی انشا پردازی کا چمنستان مہکتا تھا۔ چارلس ڈکنس کی کرشمہ سازی تھی کہ وہ اپنے ناول کے ہر کردار کو زندہ اور متحرک حالت میں پیش کرنے پر قادر تھا۔ اس کے ناول کا کوئی بھی کردار (یہ لاتعداد ہیں)، گونگا نہیں۔ ایک اچھے شعر کی تحسین میں کہا جاتا ہے کہ بولتا ہوا شعر ہے۔ چارلس ڈکنس کے اس پورے ناول کو آپ بولتا ہوا پائیں گے۔ میں نے ڈیوڈ کاپر فیلڈ کا ناول کوئی 65-60 سال پہلے اٹک اٹک کر ڈکشنری اور دوستوں کی مدد سے، پڑھا تھا۔ اس کی گونج آج بھی کانوں میں محفوظ ہے اور اس ترجمے نے تو مجھے از سر نو مخمور کر دیا۔

زیرنظر کتاب کے دو ابواب ہیں اور ہر باب کا عنوان ہی کچھ ایسا دلپذیر ہے کہ قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ پہلے باب کا عنوان ہے۔ ''میں پیدا ہوا۔''

یہ تو معلوم نہیں ہے کہ چارلس ڈکنس نے اپنا معرکتہ الآرا ناول اپنی عمر کے کس مرحلے پر لکھا لیکن اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے۔ داد دیجیے ناول نگار کے متکلم اور ہمہ وقت حاضر باش حافظے کی کہ امتداد زمانہ کی گرد اس پر نہیں جمی اور اسے اپنی پیدائش کے موقعے کی ہر بات، ہر حرکت اور حجرۂ ولادت کے حاضرین کی ہر جنبش اس طرح یاد رہی گویا وہ اپنی ولادت کا چشم دید گواہ رہا ہو — یہ منظر دیکھیے۔

''میری ماں ان سے کچھ اس قدر خائف تھیں کہ ان کی اس عجیب سی فرمائش پر عمل نہ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ لہٰذا انھوں نے ویسا ہی کیا جیسا کہ کہا گیا تھا اور انھوں نے بدحواس ہو کر ٹوپی اس طرح اتاری کہ ان کے بال (جو بہت گھنے اور خوبصورت تھے) ان کے چہرے پر بکھر گئے۔''

''اتنا گھبرا کیوں رہی ہو بیٹی،'' مس بٹسی نے کہا'' تم تو ابھی بالکل بچہ ہو'' میری ماں اتنی عمر کے باوجود بے حد خوبصورت اور کمسن نظر آ رہی تھیں۔ انھوں نے اپنا سر اس طرح جھکا لیا جیسے اتنی خوبصورت اور کمسن نظر آنے میں ان کا کوئی قصور ہو۔ وہ اس بات سے یقیناً خائف تھیں کہ وہ اتنی کم سنی میں بیوہ ہو گئیں اور اگر حیات رہیں تو ایک کمسن ماں ہی کہلائیں گی۔ چند لمحے گزر جانے کے بعد انھیں کچھ ایسا محسوس ہوا جیسے مس بٹسی ان کے بال چھو رہی ہیں اور وہ بھی بے رحمی کے ساتھ نہیں''۔ جب انھوں نے قدرے پر امید انداز میں مس بٹسی کی جانب دیکھا تو معلوم ہوا کہ وہ اپنا اسکرٹ سکوڑے اپنے ہاتھ گٹنے پر اور پاؤں آتش دانی کے جنگلے پر رکھے ہوئے آگ دیکھ رہی تھیں''۔ یہ سطریں

پڑھنے کے بعد آپ نے یقین کر لیا ہوگا کہ ناول نگار جس کے پیدا ہونے میں ابھی کچھ دیر تھی، بذات خود کمرے میں موجود تھا۔ یہی اس کے اسلوب کی کرشمہ سازی ہے، (ص 7) اور مس بٹسی کو یقین تھا کہ اب کچھ دیر میں چارلس ڈکنس کی نہیں، ایک لڑکی کی ولادت ہوگی۔ پورے ناول میں طرح طرح کے منظر خود رو پودوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں اور ناول نگار نے انھی پودوں کو اپنی شبنمی تحریر سے روئیدگی اور روشنی عطا کر دی ہے۔ براہ کرم ایک منظر اور دیکھ لیجیے یہ منظر آپ کی آنکھوں اور ذہن میں یوں بس جائے گا جیسے اس منظر کی تخلیق، تشکیل اور تجسیم ڈیوڈ نے نہیں خود آپ نے کی ہو۔ یاد رکھیے ڈیوڈ کاپرفیلڈ اب تو مولود بچہ نہیں رہا۔ اب تو اس کا ایک بھائی پیدا ہو گیا ہے۔ منظر ملاحظہ ہو۔'' خدا جانتا ہے جب میں نے ہال میں قدم رکھا تو پرانے کمرے سے ماں کی آواز سن کر بچپن کی کتنی یادیں تازہ ہو گئیں: وہ دھیمی آواز میں گانا گا رہی تھیں۔ میں سمجھتا ہوں جب میں بہت چھوٹا بچہ تھا تو ماں کی گود میں انھیں اسی طرح گاتے سنتا تھا۔ اسے یاد کر کے میرا دل بھر آیا۔ میں چپکے سے کمرے میں داخل ہو گیا، وہ آتش دانی کے پاس بیٹھی ایک شیر خوار بچے کو دودھ پلا رہی تھیں۔ میں نے کہا ''ممی'' وہ خوشی سے چلا کر آگے بڑھنے لگیں۔ کمرے میں آدھی دور تک آ کر وہ فرش پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئیں اور مجھے بے تحاشہ پیار کرنے لگیں۔ انھوں نے میرا سر اپنے سینے سے لگا لیا جہاں ننھا بچہ دودھ پی رہا تھا۔ ماں نے اس کا ہاتھ میرے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ میرا دل چاہا کہ میں مر جاؤں، میرا دل یہی چاہا کہ میں اسی وقت مر جاؤں۔ دنیا سے چلے جانے کا اس سے زیادہ مناسب موقع میرے لیے ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ '' یہ تمھارا بھائی ہے۔'' ماں نے نہایت شفقت سے کہا'' ڈیوی میرے شہزادے میرے معصوم بچے۔۔۔ ذرا ٹھہر یکھانا ہو رہا ہے'' میری پرانی پلیٹ موجود تھی جسے میری غیر موجودگی تک پیگٹی (ملازمہ) نے کہیں چھپا کر رکھ دیا تھا اور کہا میں اسے کسی قیمت پر ٹوٹنے نہ دیتی، میرا مگ، جس پر 'ڈیوڈ' لکھا ہوا تھا موجود تھا اور میری چھوٹی چھری اور کانٹا جس سے کوئی چیز آسانی سے کٹ نہ پاتی تھی، سب موجود تھے۔'' دیکھا آپ نے یہی شوخی، شگفتگی اور شادابی سے معمور اسلوب تھا جو چارلس ڈکنس کے جادوئی قلم سے صفحۂ قرطاس پر اتر کر، نوائے سروش بن جاتا تھا۔

اب تو آپ پر لازم ہے کہ آپ اس کتاب کو پڑھیں، دوران مطالعہ عش عش کرنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ کام بعد میں بھی ہو سکتا ہے۔ کرداروں کا تو اس ناول میں جم غفیر ہے۔ آپ کو سارے کے سارے کردار ہم صفیران فن کی طرح دکھائی اور سنائی دیں گے یہ بقول شخصے خاکسار کا وعدہ ہے!!

تحریک خلافت/مصنف: قاضی محمد عدیل عباسی

صفحات: 279، قیمت: -/65 روپے

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066

مبصر: محمد عمر رضا، 224۔ای، مہاندی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

ہندوستان کی جنگ آزادی میں خلافت تحریک کی بڑی اہمیت ہے۔ اس تحریک نے ہندوستان کی دو بڑی قوموں میں جو اتحاد قائم کیا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ یوں تو اس تحریک کے حوالے سے انگریزی میں بھی کتابوں کی کمی ہے لیکن اردو میں تو اس کی شدید قلت ہے۔ جو کتابیں دستیاب ہیں، ان میں مصنفین و مؤلفین نے سرسری جائزے سے ہی کام لیا ہے۔ اکثر و بیشتر کتابوں میں تاریخ تو کجا سنہ تک موجود نہیں ہے۔ ایسی صورت میں قاضی محمد عدیل عباسی کی یہ تصنیف کسی حد تک اس کمی کو ضرور پورا کرتی نظر آتی ہے۔

قاضی صاحب خود اس تحریک میں شامل تھے۔ 1918 میں ان کی عمر تقریباً 19 سال تھی۔ 1920 میں بی۔اے پاس کرنے کے بعد انھوں نے الٰہ آباد یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور ناگپور کانگریس کے ترک موالات کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ اخبار ''زمیندار'' لاہور کے چیف ایڈیٹر بھی رہے اور تحریک خلافت میں حصہ لینے کے جرم میں انھوں نے ایک سال لاہور سینٹرل جیل میں قید کی زندگی بھی بسر کی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک خلافت پر ان کی اس کتاب میں خود اعتمادی جھلکتی ہے۔

تیرہ ابواب پر مشتمل اس کتاب میں ''مسئلۂ خلافت کی نوعیت'' سے لے کر'' خلافت کے خاتمے'' تک کے تمام واقعات کو تاریخی ترتیب کے ساتھ بڑے منظم اور تفصیلی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ پہلے باب میں خلافت کی نوعیت اور ہندوستان میں اس تحریک کی اہمیت پر مدلل روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے باب میں ''مسلمانوں کی روحانی اذیت کے اسباب'' کا جائزہ لینے کی غرض سے خلافت کے تقدس، ترکی اور بلاد یورپ کے درمیان تعلقات کی نوعیت، سلطان عبدالحمید کی غداریوں اور مظالم اور اس کے نتیجے میں امت کے مصلحین کے ردعمل وغیرہ کا احاطہ کیا گیا ہے۔ تیسرا باب'' میدان عمل'' کے عنوان سے ہے جس میں خلافت کے مسئلے کو لے کر ہندوستان میں کس طرح کی قانونی جدوجہد شروع ہوئی اور خلافت کمیٹی کے قیام کے بعد کن لوگوں نے اہم رول ادا کیا وغیرہ پر جامع گفتگو کی گئی ہے۔ چوتھے باب میں'' جنگ عظیم اور ہندوستانی سیاست'' پر سیر حاصل بحث ہے۔ پانچواں باب'' تاج برطانیہ کی وفادار رعایا کی عرضداشتیں'' کے عنوان سے ہے جس میں لندن میں مقیم

حضرات کی عرضداشتوں کا ذکر ہے۔ اس معاملے میں وزیر ہند کا جواب اور یہودیوں وفلسطینیوں کے رویّوں کا بھی تذکرہ ہے۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں خلافت وفد کے متعلق ندوۃ العلما لکھنؤ کی تجویز، دارالعلوم دیوبند کا رویّہ اور مہاتما گاندھی کے خیالات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ چھٹا باب ''مذہب کی راہ سے مسلمانوں کو سیاست میں لانے کے لیے مولانا آزاد کی کوششوں'' کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ساتویں باب میں ''اعلانِ وفاداری کا انجام'' کے زیرعنوان یورپ اور ترکی کے حالات اور دیگر ضروری امور کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ آٹھویں باب میں ''مہاتما گاندھی کا اعلانِ جنگ'' کے تحت مہاتما گاندھی کی قیادت، لوک مانیہ تلک کے رول، مولانا محمود حسن کی آمد، جمعیۃ العلما ہند کی کارگزاری اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام وغیرہ کا ذکر ہے۔

نویں باب میں تحریک خلافت کے زمانۂ عروج کا بیان ہے جس میں یہ بتانے کی سعی کی گئی ہے کہ کس طرح ملک کی تمام عوام اس تحریک میں شامل ہو رہی تھی اور ان کا تعاون حاصل ہو رہا تھا۔ اس پر حکومت کا ردّعمل بھی ظاہر ہوا جس کا تفصیلی بیان دسویں باب میں ''حکومت کا ردّعمل'' کے زیرعنوان ہے۔ گیارھویں باب میں ''جنگ ترکی و یونان'' پر بحث کی گئی ہے۔ اس کے تحت مصطفےٰ کمال کے تدبّر، ترکی کی فوجی حالت اور یونانیوں کے مظالم، مصطفےٰ کمال کی برخاستگی، بولشویکوں سے تعلقات اور فتح ترکی پر تحریک خلافت کے اثرات وغیرہ کا تفصیلی اور معلوماتی جائزہ لیا گیا ہے۔ بارھواں باب ''تحریک خلافت کا دوسرا دور'' کے زیرعنوان ہے اور تیرھواں باب ''خلافت کا خاتمہ'' کے عنوان سے ہے جس میں تحریک خلافت کے اختتام کا تو ذکر کیا ہی گیا ہے، اس کے ساتھ ساتھ اس تحریک سے ہندوستان کی تحریکِ آزادی کو جو تقویت ملی، اس پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔ اگرچہ اس کا تذکرہ پوری کتاب میں جابجا نظر آتا ہے لیکن یہ باب قدرے منظم شکل میں ہے۔ قاضی صاحب چوں کہ اس تحریک کے چشم دید گواہ ہیں اور انھوں نے اس اہم تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ بھی لیا ہے، اس لیے زیرتبصرہ کتاب میں ان کے اپنے تجربات ومشاہدات بھی شامل ہیں۔

مجموعی طور پر ''تحریک خلافت'' کی حقیقی تصویر جاننے، تحریک آزادی میں اس کے اہم رول اور آزادی سے متعلق اس دوران ہو رہے دیگر ضروری حالات وواقعات سے واقفیت کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بے حد ضروری اور مفید مطلب ہے۔ ضخامت اور طباعت کے اعتبار سے قیمت بہت ہی مناسب ہے۔ امید ہے قارئین اس اہم تاریخی اور دستاویزی کتاب سے ضرور استفادہ کریں گے۔

غضب ناک صلیب
مصنف: اے۔ کے۔ سری کمار
مترجم: مظہر احمد
صفحات: 150، قیمت: -/32 روپے
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک۔1، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی۔110066
مبصر: محمد نوشاد عالم، 247 سابرمتی ہاسٹل، جے این یو، نئی دہلی

''غضب ناک صلیب'' میں ایک گم شدہ خزانے کی کہانی بیان کی گئی ہے۔ ہماری زبان میں رائج قصوں میں اس طرح کے گم شدہ اور مدفون خزانوں سے متعلق بہت سے واقعات اور قصے بیان کیے جاتے رہے ہیں۔ اسی طرح کی ایک کہانی اس میں بیان کی گئی ہے جس کی بازیافت میں کچھ بہادر بچے بھی شامل رہے ہیں۔ ان بچوں نے اپنی ذہانت اور جرأت کا ہر موقعے پر احساس دلایا ہے۔ بچوں کے کارناموں پر مشتمل یہ کہانی پڑھ کر بچوں میں اپنی خوابیدہ صلاحیتوں سے کام لینے کا حوصلہ پیدا ہوگا۔

پوری کہانی ایک گم شدہ خزانے کو دوبارہ پائے جانے کے گرد گھومتی ہے۔ یہ خزانہ ایک ملک سے دوسرے ملک سمندری راستے سے لے جایا جا رہا تھا لیکن مطلوبہ جگہ پر پہنچنے سے قبل ہی اسے بحری قزاقوں نے لوٹ لیا۔ لٹیرے پکڑے گئے لیکن ان کے سردار نے خزانہ کہیں دفن کر دیا تھا جو کسی کے ہاتھ نہ آ سکا۔ البتہ پھانسی دیے جانے کے وقت سردار نے حاضرین کی جانب ایک نقشہ پھینکا جس میں وہ اشارے درج تھے جن کے ذریعے خزانے تک پہنچنا ممکن تھا اور بالآخر اسی نقشے نے اس کی حصولیابی میں مدد کی۔

آج ہمارا معاشرہ ایسی کہانیوں کو خواہ بے وقعت ہی گردانے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ کہانیاں بچوں کی ذہنی تربیت کا ایسا سامان مہیا کرتی ہیں جس کا بدل کچھ بھی نہیں نیز بعض مورخین نے قدیم زمانے سے رائج قصوں اور کہانیوں پر یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اس میں متعلقہ عہد کی تہذیب و معاشرت کے ایسے شاندار تہذیبی مرقعے پائے جاتے ہیں کہ تاریخ ان کا بدل پیش کرنے سے قاصر ہے اور اس حقیقت کا بھی اعتراف کیا گیا ہے کہ انسانی ارتقا کی داستان جس طرح کہانیوں میں ملتی ہے دوسری اصناف میں نہیں۔

اس کہانی میں ایک مخصوص خطّے کی تہذیب پر روشنی ڈالی گئی ہے جہاں آج بھی شادی کا وہ طریقہ رائج نہیں ہے جسے دنیا کے بیشتر خطوں میں مہذب سماج کی علامت سمجھا جاتا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دنیا میں ایسے خطے اور علاقے بھی ہیں جہاں شادی بیاہ کے رسوم بے معنی خیال کیے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مذکورہ کہانی کے ذریعے بعض ایسی معلومات حاصل ہوتی ہیں جو

نہایت دلچسپ ہیں۔

کہانی بہت دلچسپ پیرائے میں بیان کی گئی ہے۔ ترجمہ سادہ اور سلیس ہے امید ہے یہ کتاب بچوں میں بہت مقبول ہوگی۔ دیدہ زیب گٹ اپ اور نفیس طباعت کے باوصف قیمت بہت مناسب ہے۔

سہ ماہی "ادب ساز"

مدیر: نصرت ظہیر

مدیر انتظامی: مودود صدیقی

معاون مدیر: ثمینہ پروین، شبنم پروین

قیمت، فی شمارہ: تین سو روپے (ہندوستان) تین سو بیس روپے (پاکستان)

پتہ: 4/15 کھجوری پور، دہلی 110091

مبصر: محمود سعیدی، بی 3/141۔ سی، کرشنا کنج ایکسٹنشن، لکشمی نگر، نئی دہلی

سہ ماہی "ادب ساز" کا اجرا اردو کی ہم عصر ادبی صحافت کا ایک اہم واقعہ ہے۔ اس رسالے کے مدیر مشہور صحافی اور مقبول طنز و مزاح نگار نصرت ظہیر ہیں جو اپنے قارئین کا ایک وسیع حلقہ رکھتے ہیں اور اس حلقے میں شامل لوگ ان کی ادبی ذہانت اور سیاسی بصیرت دونوں سے بخوبی واقف ہیں۔ "ادب ساز" کی پیش کش میں اس کے صفحۂ اول سے صفحۂ آخر تک جو سلیقہ نظر آتا ہے اور اس میں جو نثری اور شعری مواد یکجا کر دیا گیا ہے وہ نصرت ظہیر کی مدیرانہ صلاحیتوں پر بھی دلالت کرتا ہے۔

رسالے کا آغاز ایک مباحثے سے ہوا ہے جو مغربی اور اسلامی دنیا کے درمیان تہذیبی اور فکری نیز سیاسی سطح پر پائے جانے والے اس تضاد و تصادم کو سامنے لاتا ہے جس نے نیو یارک کے ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے انہدام کے بعد نئی شدت اختیار کر لی ہے۔ اس مباحثے کے شرکا میں انبساط احمد علوی، ڈاکٹر منظور عالم، پروفیسر ظہور محمد خاں اور فرحت احساس شامل ہیں۔ امریکہ جب تک سوویت یونین سے نبرد آزما تھا، اس نے اسلام پسند قوتوں کے ساتھ اخلاص جتانے کی سرگرم کوشش کی کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ یہ طاقتیں روس کے لا دینی نظام کے خلاف اس کی صف آرائی میں کہیں نہ کہیں اس کی معاون ہو سکتی ہیں لیکن جیسے ہی سوویت یونین اپنے اندرونی تضادات نیز امریکی ریشہ دوانیوں کے نتیجے میں بکھراؤ کی زد میں آیا، امریکہ نے اپنا اگلا ہدف اسلامی دنیا کو قرار دے لیا کیونکہ اب اس کے استعماری عزائم میں اسلام پسند قوتیں ہی مزاحم ہو سکتی تھیں۔

اس خیال انگیز مباحثے کے فوراً بعد کچھ صفحے امرتا پریتم کے لیے وقف کیے گئے ہیں۔ امرتا پریتم کی کہانیوں اور نظموں کے تراجم کے علاوہ اس حصے کی ایک اہم چیز امروز سے اسا سلیم کی گفتگو ہے جو امروز اور امرتا پریتم کے باہمی تعلق کو بہت ہی پر اثر انداز میں سامنے لاتی ہے۔ امرتا پریتم کی جو کہانیاں اور نظمیں شامل ہیں، ان کا ترجمہ بھی اسا سلیم نے کیا ہے اور بڑی خوبی سے کیا ہے۔

پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ہمہ جہت شخصیت سے کون اردو والا ہے جو واقف نہ ہو۔ تحقیق، تنقید، تدوین، سب ان کی جولاں گاہ فکر و عمل میں شامل ہیں لیکن اپنے تمام تر علمی انہماک کے ساتھ ساتھ اردو زبان کی بقا اور اس کی ترقی کے لیے بھی وہ کوشاں رہے ہیں، نصرت ظہیر نے ان سبھی حوالوں سے ان سے گفتگو کی ہے اور ان کے سوالوں کے نارنگ صاحب نے جو جوابات دیے ہیں، انھیں پڑھ کر ہندوستان کا پورا علمی، ادبی اور لسانی منظر نامہ ذہن میں روشن ہو جاتا ہے۔

"باب تنقید" میں جو پروفیسر شکیل الرحمن کے نام معنون ہے، سات مضامین شامل ہیں جن میں ایک مضمون پروفیسر شکیل الرحمن کا بھی ہے۔ خصوصی مطالعے کے زیر عنوان ایک شاعر اور ایک فکشن نگار کا انتخاب کیا گیا ہے۔ شاعر ہیں حمایت علی شاعر اور فکشن نگار ہیں، سید محمد اشرف۔ حمایت علی شاعر کی خوبی یہ ہے کہ عمر کی ان منزلوں میں پہنچ کر بھی جہاں اکثر شاعر خود کو دہرانے لگتے ہیں، وہ تازہ دم بھی ہیں اور تازہ کار بھی۔ سید محمد اشرف جب ہمارے ادبی افق پر نمودار ہوئے تو افسانے کی دنیا پر کچھ بے دلی سی چھائی ہوئی تھی، ان کی تحریروں سے جو روشنی پھیلی وہ بے دلی کی اس دھند کو دور کرنے میں بہت معاون ہوئی اور کم ہوتی ہوئی رونق جیسے لوٹ آئی۔ دونوں گوشے بھرپور ہیں اور معتبر قلمکاروں کی تحریروں سے مزین۔ دونوں کی منتخب نگارشات بھی دی گئی ہیں۔

"باب غزل" مرحوم نشتر خانقاہی کے نام معنون ہے اور اس میں نشتر خانقاہی کا ایک خط اور ایک حمد انھی کی تحریر میں نیز پانچ غزلیں شامل کی گئی ہیں۔ ان کے علاوہ 33 شعرا اور شاعرات کی غزلیں اس باب میں شامل ہیں۔ "باب افسانہ" بشریٰ رحمن کے نام ہے اور انیس افسانے 158 صفحات پر پھیلے ہوئے ہیں۔ "باب نظم" محمود شام کی نذر ہے جس میں نظموں کے علاوہ رباعیاں، تضمین، دوہے، ماہیے وغیرہ سبھی شامل ہیں۔ ایک حصہ متفرقات پر مشتمل ہے جس میں ناولٹ، سفر نامہ، آپ بیتی نثری طنز و مزاح، مزاحیہ نظمیں، تھیٹر، موسیقی سبھی کچھ شامل ہے۔ پھر کتابوں پر تبصرے ہیں "نوازش نامے" کے تحت وہ خطوط درج ہیں جو مدیر کو مختلف قلمکاروں نے لکھے ہیں۔ آخر میں "اس انجمن میں" کے زیر عنوان ان قلمکاروں کا مختصر تعارف درج ہے جن کی نگارشات اس شمارے میں شامل ہیں۔

رسالے میں بعض تحریریں مطبوعہ بھی شامل کر لی گئی ہیں، آئندہ اس سے احتراز کیا جائے تو بہتر ہوگا۔ رسالے کے انتظامی مدیر مودود صدیقی ہیں جو اس کام کا وسیع تجربہ رکھتے ہیں، امید ہے ان کا تعاون رسالے کو مستحکم بنیادیں فراہم کرے گا۔

سلکِ معنی

مصنف: شیخ سلیم احمد

صفحات: 304، قیمت:-/200 روپے

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، لال کنواں، دہلی۔6

مبصر: حقانی القاسمی، بہ معرفت عابد انور، 64۔ڈی، فلیٹ نمبر 10، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی۔110025

ناتواں، کمزور کتابوں کے انبوہ میں کسی توانا تابندہ کتاب سے آنکھوں کا رشتہ قائم ہو جائے تو علم و ادب کے زوال کا احساس کچھ کم ہو جاتا ہے۔ سلکِ معنی ایسی ہی ایک کتاب ہے جس میں مضمحل اور منفعل مضامین نہیں ہیں بلکہ متحرک اور فاعلی نوعیت کی تحریریں ہیں۔

موضوعی تنوع اور تلون کی وجہ سے 'سلک معنی' میں امتداد کیف، کی کیفیت پیدا ہو گئی ہے، یک نوئی، یک رنگی مضامین ہوتے تو یقیناً قاری کو بوریت اور اکتاہٹ بے چین کر دیتی مگر سلک معنی کے مضامین 'دیدۂ دل' سے لکھے گئے ہیں اس لیے قاری کے ذہن سے رشتہ قائم کرنے میں کامیاب ہیں۔

شیخ سلیم احمد کا ذہن مربوط اور منضبط ہے۔ کسی قسم کے لسانی، مذہبی اور فکری انتشار سے آلودہ نہیں ہے اس لیے ان کی تحریر میں صباحت اور شفافیت ہے۔ فکری صلابت اور استحکام ہے۔ وہ کنفیوژن اور ژولیدگی نہیں ہے جو آج کے ادیبوں کی تحریروں سے عیاں ہے۔ ادعائیت اور نظری، فکری جبریت کے کل سے انقطاع کی وجہ سے ان کی رسائی کائناتی وحدت کے کل تک ممکن ہو سکی ہے اور یہی 'کل' ان کی فکر کا محور ہے۔ اس کا ثبوت 'رنگ دیگر' کے مضامین ہیں جن میں لسانی، تہذیبی وحدت کے ساتھ ان فکری مشترکات کی تلاش کا عمل روشن ہے جو مختلف مذاہب کے مابین ہیں۔ تصوف کی سماجی معنویت، ویدک دھرم اور اسلام میں جو فکری زاویے ہیں انھی زاویوں سے ذہن کے تاریک گوشوں کو روشنی ملتی ہے اور تعصبات کے اندھیرے دور ہوتے ہیں۔ روحانی طلعت اور باطنی جمہوریت ہی ان کی تحریر کی روح ہے اور یہ 'روح' ان مضامین میں بھی روشن ہے جو متنازعہ اور مختلف فیہ مسائل اور تصورات کے حوالے سے لکھے گئے ہیں۔ مثلاً ایک گھر جو تقسیم ہو گیا، جدیدیت کی سیر وغیرہ۔

ناقد کی حیثیت سے شیخ سلیم احمد کی شناخت زیادہ مستحکم نہیں ہے لیکن ان کے تنقیدی مضامین کند شعور و احساس اور ماؤف دماغ نقادوں سے بدرجہا بہتر ہیں۔ بہت سے فکری رویوں کی گرہ کشائی جس طور پر انھوں نے کی ہے، وہ ان تصورات کی تبلیغ کرنے والوں سے بھی شاید ممکن نہ ہوتی۔ تنقیدی جارگن، کلیے، مصلحت، منافقت اور جانبداری سے احتراز و اجتناب نے ان کی تنقید کی روح کو شکستگی سے بچائے رکھا ہے۔

شیخ سلیم احمد کے جستجو آشنا ذہن نے وہ طرفیں تلاش کر لی ہیں جو اکثر آنکھوں سے مخفی رہ جاتی ہیں۔ 'نیاز فتح پوری دانشوری کی تابندہ روایت' اور 'مولانا ابوالکلام آزاد اور مقامات درویشی' ایسے ہی مضامین ہیں۔

یہ کتاب شیخ سلیم احمد کے فکری وجود کے مبتدا و خبر سے صرف باخبر نہیں کرتی بلکہ ذہن کے خالی خطوں کو سرسبز و شاداب بھی کرتی ہے۔ فرہنگ اور فکری فہرست کے اعتبار سے 'سلک معنی' نفع بخش اور مفید کتاب ہے۔ چند مضامین کی شمولیت سے گریز کیا جاتا تو کتاب مزید، معنی خیز ہو جاتی۔

ادبی محاکے

مصنف: احمد امتیاز

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی عزیز الدین وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔110006

قیمت:-/150 روپے

مبصر: ظہیر رحمتی، شعبۂ اردو، ذاکر حسین کالج، دہلی۔2

''ادبی محاکے'' مختلف موضوعات پر 16 مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل مصنف کی تین کتابیں ''ارمغان ادب'' ''رشید احمد صدیقی کے فکری مناسبات'' اور ''محمد بدیع الزماں اقبالیات کے آئینہ میں'' منظر عام پر آ چکی ہیں۔ یوں تو اس مجموعے میں شامل تمام مضامین موضوع اور مواد کے لحاظ سے لائق توجہ اور قابل قدر ہیں لیکن ان میں ''تنقید کا منصب'' ''ناول کا فن'' ''خواجہ احمد فاروقی: عصری اسالیب کے تناظر میں'' ''بین کرتا ہوا شاعر: عتیق اللہ'' اور ''آزادی کے بعد میتھلی زبان پر اردو کے اثرات'' بالخصوص لائق توجہ ہیں۔ مجموعے کے پہلے مضمون ''تنقید کا منصب'' میں مصنف کے فن تنقید کے مقاصد، اس کے دائرۂ کار اور اس کے سروکاروں کو اجاگر اور متعین کرنے کے لیے مختلف ناقدین کی آرا کا محاسبہ کیا ہے اور تنقید کو شعریات و بدیہیات سے ممیز و متمائز کرنے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے بجا طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ''تنقید کے معنی ہی تفہیم کے ہیں اگر وہ تخلیق سے پیدا ہونے والے سوالوں کا جواب فراہم نہیں کرتی یا تخلیق سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کو رفع نہیں کرتی تو اس کا ہونا یا نہ ہونا برابر ہے۔'' لیکن مصنف کی اس رائے میں کلام ہے کہ ''تنقید نہ تو محض شعریات کے ساتھ مشروط ہے اور نہ محض فلسفہ و علوم کے ساتھ۔'' درحقیقت شعریات محض فن شاعری (بدیعات و عروض وغیرہ) کے مترادف نہیں ہے بلکہ اس اصطلاح کے مفہوم میں ادب و شعر سے متعلق تمام جمالیاتی اور فلسفیانہ رموز و نکات شامل ہیں اس لیے تنقید لازمی طور

پر شعریات سے استفادہ کرتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ فلسفہ وعلوم سے بھی لیکن یہ صحیح ہے کہ تنقیدی عمل ان تمام امور میں بھی جاری وساری رہتا ہے۔ اس لحاظ سے تنقید ان سب سے بالاتر ہے۔ زیر نظر مضمون میں مصنف نے شمس الرحمٰن فاروقی کی نگارشات سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور کہیں کہیں بزرگ ناقد سے اختلاف بھی کیا ہے۔ مصنف کو فاروقی صاحب کی اس رائے سے اختلاف ہے کہ '' افلاطون اور ہیگل نے مارکسی سیاست کی انتہا پسندی اور کانٹ اور نطشے نے '' نازی بہیمیت'' کو جنم دیا۔ مصنف کا خیال ہے کہ '' کہاں افلاطون کا آدرش وادی فلسفہ جس کی بنیاد اخلاقیات اور تصورات پر استوار ہے اور کہاں مارکس کی جدلیاتی مادیت اور تاریخ کا مادی اور سائنسی تصور۔ حتیٰ کہ ہیگل بھی ایک عینی فلسفی تھا۔'' یہ صحیح ہے کہ افلاطون و ہیگل عینیت پرست فلسفی اور مارکس مادیت پرست تھا لیکن مصنف نے ظاہری اختلافات کی بنیاد پر تینوں فلسفیوں کے طریقۂ کار اور بنیادی مفروضات یا مسلمات کو نظر انداز کر دیا جس کی بنا پر فاروقی صاحب کی رائے بظاہر متناقض نظر آتی ہے۔ بحیثیت مجموعی زیر نظر مضمون بہت وقیع ہے جس میں بہت سے بنیادی سوالات کا احاطہ کیا گیا ہے۔

'' ناول کا فن'' میں مصنف نے مغربی ناقدین کا احاطہ کرتے ہوئے پلاٹ، کردار، ماحول، نظریہ اور اسلوب پر بحث کرتے ہوئے مختلف مقالوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ناول کا آرٹ ایک اوپن (Open) اور حرکی فن ہے۔ اس لیے یہ ضروری نہیں کہ کسی کامیاب ناول میں مذکورہ تمام اجزائے ترکیبی لازمی طور پر موجود ہوں۔ مصنف کے ناول کے پلاٹ اور ڈرامے کے پلاٹ میں تفریق قائم کرتے ہوئے پلاٹ کی تعریف یعنی واقعے کے منطقی تسلسل پر کاری ضرب لگائی ہے۔ وہ کلیم الدین احمد کے اس خیال سے اتفاق کرتے ہیں کہ ناول میں پلاٹ کی کوئی خاص اہمیت نہیں۔ مصنف کے نزدیک پلاٹ کے عمومی تصور کو رد کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ناول زندگی کو اس کی فطری رو کے مطابق اخذ کرے۔

'' بین کرتا ہوا شاعر: عتیق اللہ'' میں مصنف نے معروف ناقد و شاعر پروفیسر عتیق اللہ تابش کی شعری ترجیحات پر روشنی ڈالی ہے۔ عتیق اللہ تابش کی شاعری جدیدیت کے رجحان کی شاعری ہے۔ خصوصاً ان کی غزل اپنی علامتوں، استعاروں اور تراکیب کے باوصف جدید انسان کے کرب، اس کی ذہنی اذیتوں اور مسائل کا بخوبی احاطہ کرتی ہے اور انھیں جدید بڑے شعرا کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ عتیق اللہ تابش کی شاعری پڑھ کر یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ جینوئن فن کار کے لیے معروضی تنقیدی بصیرت اور علم کی گہرائی سم قاتل ہوتی ہے۔ اگر عتیق اللہ تابش تنقیدی جھمیلے سے دامن کشا ہوتے تو یقیناً ان کا شعری مرتبہ بلند سے بلند تر ہوتا۔ زیر نظر مضمون میں مصنف نے اہم جدید شعرا کے تقابل اور موازنے کے ذریعے تابش کا شعری مرتبہ متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔'' پروین شاکر کی شاعری'' میں مصنف نے نسائی شاعری کی وضاحت کرتے ہوئے ہم عصر شاعرات کے تقابل وموازنے کی روشنی میں پروین شاکر کی شعری کائنات پر روشنی ڈالی ہے۔ مصنف کے نزدیک شاعرات کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ ان کے شعری تجربے ان کی ذات تک محدود ہیں۔ ان کے یہاں کائنات کے اسرار ورموز کی افہام وتفہیم نہیں ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ شاعرات کے یہاں خصوصاً پروین شاکر کے یہاں جنسی جذبہ حاوی ہے اور اسی جنسی اظہار کی وجہ سے ان کی انفرادیت قائم ہوئی ہے۔ مصنف کے نزدیک پروین شاکر کے یہاں جنسی جذبہ جس شان سے نمودار ہوتا ہے اس سے اخلاقی اقدار پامال ہوتی ہیں۔ اس مضمون میں مصنف کا نقطۂ نظر بڑی حد تک اخلاقی ہے جس کی وجہ سے وہ شعری بیان کی تازگی اور ندرت کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ حالاں کہ شاعری ہیئت سے وجود میں آتی ہے خیال (Idea) سے نہیں اس لیے کسی شاعر کے مرتبے کا تعین کرتے وقت معروضی پیمانہ ہیئتی اصول ہی ہوتا ہے۔

'' آزادی کے بعد میتھلی زبان پر اردو کے اثرات'' اس کتاب کا انتہائی اہم مضمون ہے جس میں مصنف نے انتہائی عرق ریزی اور تحقیق کے ساتھ یہ حقیقت آشکار کی ہے کہ آزادی کے بعد اردو کو ختم کرنے کی انتہائی کوششوں کے باوجود بھی اردو اس قدر پر اثر زبان ہے کہ اس کے واضح اثرات میتھلی زبان پر بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ مصنف نے مختلف مثالوں سے یہ واضح کیا ہے کہ میتھلی زبان میں اردو کے مخصوص تہذیبی الفاظ ومعانی روزمرہ کی صورت میں موجود ہیں مثلاً '' بسمل (بسم اللہ)، روجا (روزہ) کو جا (کوزہ) نماج (نماز) اسی طرح اردو محاورے، روزمرہ اور ادبی پیرایۂ اظہار کی مختلف صورتوں سے بھی میتھلی زبان نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔ زیر نظر مضمون کے نتیجے میں یہ امید کی جاسکتی ہے کہ اگر ہندوستان کی دیگر زبانوں پر بھی اردو کے اثرات کی نشاندہی کی جائے تو ایک وقیع کام منظر عام پر آسکتا ہے جو اردو دشمنوں کے لیے دندان شکن ثابت ہوگا۔ ڈاکٹر احمد امتیاز کو اس موضوع پر مزید تحقیق وجستجو کرنا چاہیے۔

بحیثیت مجموعی '' ادبی محاکے'' اہم تنقیدی وتحقیقی مضامین کا مجموعہ ہے جس کا مطالعہ ذوق تحقیق وجستجو کو مزید مہمیز کرتا ہے۔

□□□

مصنف: پرادینا بھیم سین
مترجم: رفیق محمد شاستری

بچوں کا گوشہ

"ہمارے رہنما" سے ماخوذ

زندگی کو سمجھنے اور اسے بہتر بنانے میں اچھا ادب معاون ہوتا ہے ساتھ ہی اپنے پڑھنے والوں کو یہ ذہنی تفریح بھی بہم پہنچاتا ہے۔ بڑوں کی طرح بچوں کا بھی یہ حق ہے کہ ان کی ذہنی ضرورتوں کے مطابق انھیں اچھا ادب فراہم کیا جائے جو سبق آموز ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہو تاکہ بچے خوشی خوشی اس کا مطالعہ کریں۔ قومی اردو کونسل نے بچوں کے لیے بڑی تعداد میں ایسی کتابیں شائع کی ہیں جو اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔

ذیل میں قومی اردو کونسل کی شائع کردہ کتاب "ہمارے رہنما" جلد پنجم سے گوپال کرشن گوکھلے کے احوال و کوائف اور قومی خدمات سے متعارف کرایا گیا ہے۔ وی۔ایس۔ سری نواس شاستری، خان عبدالغفار خاں اور میگھ ناتھ ساہا کے احوال و کوائف پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔اس کتاب میں ان تمام قومی رہنماؤں کی حیات و خدمات سے واقف کرایا گیا ہے جنھوں نے ملک و قوم کی خدمات کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی۔ "ہمارے رہنما" 107صفحات کی اس کتاب کی قیمت -/35 روپئے ہے۔ قومی اردو کونسل اپنی مطبوعات پر طلبہ کو 45 فیصد اور اساتذہ کو 40 فیصد کی خصوصی رعایت دیتی ہے۔

گوپال کرشن گوکھلے

1895 میں انڈین نیشنل کانگریس کا گیارھواں اجلاس پونہ میں ہوا تھا جس کی صدارت سریندر ناتھ بنرجی نے کی تھی۔وہ ہمارے ان رہنماؤں میں سے تھے جنھوں نے ہندوستان والوں کے دلوں میں قومی بیداری پیدا کی تھی۔ وہ ایک عہد ساز شخصیت کے مالک تھے اور جادو بیان مقرر تھے۔ انھوں نے کانگریس کے اس اجلاس میں نمک کے ٹیکس میں کمی کرنے کی ایک تجویز پاس کرائی۔

روزمرہ کے استعمال کی اس اہم چیز نمک پر برطانوی حکومت کی اجارہ داری یا پورا کنٹرول تھا اور ہندوستان کے کسی بھی آدمی کے لیے نمک بنانا غیرقانونی تھا۔ برطانوی حکومت نے شروع ہی سے نمک پر ٹیکس لگا رکھا تھا جو سرکاری آمدنی کا ایک اہم ذریعہ تھا۔ 1888 میں اس ٹیکس میں اور اضافہ کر دیا گیا تھا جس کا غریبوں پر بہت برا اثر پڑ رہا تھا۔

تجویز کی حمایت میں گوپال کرشن گوکھلے نے جو تقریر کی وہ دل کو چھو لینے والی تھی۔ انھوں نے اپنی تقریر میں ہندوستان کے غریب عوام کی انتہائی غربت کی حالت کا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا کہ کس طرح بھوکے، لاغر انسان صبح سویرے سے لے کر رات تک مشقت کرتے ہیں اور اس پر بھی انھیں دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہوتی۔ یہ غربت کی چکی میں پسنے والے عوام اپنی آواز حکمرانوں کے ایوان تک نہیں پہنچا سکتے اور ہر زیادتی کو اپنا مقدر سمجھ کر جھیل جاتے ہیں۔

گوکھلے کے دل میں اپنے ملک کے لوگوں کے لیے جو درد تھا اور انسان کی عظمت کا جو احترام تھا اس کی گونج ان کی تقریر کے الفاظ میں صاف طور پر سنی جا سکتی تھی۔ لوگوں کے دکھ درد کو بانٹنے کے اس جذبے کو لے کر انھوں نے اپنی پوری زندگی ملک کی خدمت کے لیے وقف کر دی۔

ابتدائی زندگی

گوپال کرشن گوکھلے 9 مئی 1866 کو مہاراشٹر کے ایک غریب برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ مہاراشٹر کے ایک دور دراز کے کوٹلک گاؤں میں اپنے نانا کے گھر ان کی پیدائش ہوئی۔ یہ گاؤں اس زمانے کی بمبئی پریسیڈنسی (اب مہاراشٹر) کے رتناگری ضلع میں واقع ہے۔ قریب ہی ان کے باپ کرشنا راؤ کا گاؤں تمہن مالا تھا۔ تمہن مالا میں کرشنا راؤ کا ایک چھوٹا سا کھیت تھا۔ مگر وہاں کی زمین زرخیز نہیں تھی اس لیے سارا علاقہ کافی غریب تھا۔ کرشنا راؤ نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور کاگل میں آباد ہو گئے۔ جہاں انھیں کلرک کی نوکری مل گئی تھی۔ اپنی ایمانداری اور خودداری کی وجہ سے اس علاقے میں ان کی بڑی

عزت تھی۔

گوپال کی ماں والوبائی عرف ستیہ بھاما ایک سادہ مزاج اور دین دار عورت تھیں۔ انھوں نے بچوں میں خاندان سے محبت، مذہبی طور طریقے اور ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا۔ گوپال کو اپنے ماں باپ کی یہ خوبیاں وراثت میں ملیں۔

1879 میں کرشن راؤ کا انتقال ہوگیا، انھوں نے اپنی بیوی، دو لڑکوں اور چار لڑکیوں کو بڑی غریبی کی حالت میں چھوڑا تھا۔ اس وقت گوپال کی عمر 13 سال کی تھی۔ اپنے خاندان کے ایک ہمدرد وی. پی. دویدی کی مدد سے بڑے بھائی گوبند راؤ کو 15 روپے مہینہ کی ملازمت مل گئی۔

گوپال کی 1880 میں شادی ہوگئی۔ ان کی بیوی ساوتری بائی ایک مہلک بیماری میں مبتلا تھیں اور زیادہ دن زندہ نہ رہیں۔ اپنی ماں اور چچا اتاجی کی ناراضگی سے بچنے کے لیے انھوں نے 1887 میں دوبارہ شادی کر لی۔ مگر ان کی دوسری بیوی بھی ایک بچے کی پیدائش کے موقع پر فوت ہوگئیں۔ وہ اپنی دو بیٹیاں چھوڑ گئیں۔

تعلیم

گوبند راؤ اور ان کی بیوی نے گوپال کی تعلیم کے لیے کافی قربانی دی۔ کولھاپور کے راجہ رام ہائی اسکول میں گوپال کی تعلیم کے لیے انھوں نے ہر مہینے 8 روپے کی رقم الگ کر دی تھی۔

ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہی یہ ظاہر ہونے لگا تھا کہ گوپال میں ایمانداری اور خلوص کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے۔ تعلیم میں بڑے بھائی ان کی جو مدد کر رہے تھے اس کا انھیں بہت پاس تھا۔ انھیں جو بھی رقم ملتی اس میں ہی وہ اپنا کام چلاتے اور کبھی زائد خرچ کی مانگ نہ کرتے۔ انھیں اکثر فاقہ کرنا پڑتا اور سڑک کی لالٹین کے نیچے پڑھنا پڑتا۔

اسکول میں گوکھلے کافی خاموش طبیعت کے لڑکے تھے۔ وہ بہت غیر معمولی طالب علم تو نہیں تھے مگر وہ بے حد محنتی اور حوصلہ مند ضرور تھے۔ ان کی یادداشت بہت تیز تھی۔ برطانوی مصنف اور سیاست داں ایڈمنڈ برک کا مقالہ ''ریفلیکشن آن دی فرنچ ریولیوشن (فرانسیسی انقلاب پر تاثر) کے پیراگراف کے پیراگراف انھیں ازبر ہوگئے تھے جنھیں وہ صرف زبانی سنا ہی نہیں سکتے تھے، سمجھا بھی سکتے تھے۔ ایسا بھی بارہا ہوا کہ ان کے اسکول کے ساتھیوں سے ہر غلطی پر ایک ایک آنے کی شرط لگ گئی۔ لیکن وہ ہمیشہ بازی مار لے گئے۔

1884 میں انھوں نے بمبئی کے الفنسٹن کالج سے گریجویشن کی ڈگری لی۔ آخری سال میں انھیں 20 روپیہ ماہانہ کا وظیفہ بھی ملنے لگا تھا۔

گوکھلے کی تعلیم نے ان کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا۔ الفنسٹن کالج میں انگریزی کے پروفیسر ڈاکٹر ورڈس ورتھ نے انگریزی ادب اور شاعری کے مطالعے میں ان کی دلچسپی پیدا کی۔ ڈاکٹر ورڈس ورتھ انگریزی کے مشہور زمانہ شاعر ورڈس ورتھ کے پوتے تھے۔ انگریزی زبان و ادب پر گوکھلے کی بہت اچھی قابلیت ہوگئی۔ وہ انگریزی زبان میں اپنے خیالات کا اظہار بہت فصاحت اور روانی سے کر سکتے تھے۔ ان کی اس خوبی نے انھیں جادو بیان مقرر اور بے مثال پارلیمنٹیرین بنا دیا۔

اس کالج میں ریاضی کے استاد پروفیسر ہاتھورن ویٹ نے ریاضی کے مضمون میں ان کی دلچسپی پیدا کی۔ اقتصادیات پر گوکھلے کو اچھی گرفت تھی۔ ریاضی کی مدد سے انھوں نے اس میں اور اچھی استعداد پیدا کی اور اعداد و شمار کا وہ موثر استعمال کرنے لگے۔

بے لوث استاد

گریجویشن کے بعد گوکھلے انڈین سول سروس میں شامل ہونا چاہتے تھے یا پھر انجینئر یا وکیل بننا چاہتے تھے، جو بہت منافع بخش پیشے تھے۔ پونہ کے دکن کالج میں ایک سال کے لیے انھوں نے قانون کے شعبے میں داخلہ لے لیا مگر انھوں نے ان نفع بخش پیشوں میں جانے کا خیال چھوڑ دیا۔ اس وقت انھیں سب سے بڑی فکر اپنے بھائی کو مالی مدد پہنچانے کی تھی۔

1885 میں انھوں نے پونہ کے نیو انگلش اسکول میں 35 روپے ماہانہ پر اسسٹنٹ ماسٹر کی حیثیت سے ملازمت شروع کر دی۔ اپنی آمدنی بڑھانے کے لیے انھوں نے پبلک سروس سرٹیفکیٹ امتحان دینے والوں کی کوچنگ بھی شروع کر دی۔ گوکھلے معلّمی کے پیشے میں جی جان سے جٹ گئے۔ انھیں چوتھی اور پانچویں جماعت میں انگریزی اور ریاضی پڑھانے کا کام سونپا گیا۔ وہ سبق پوری طرح تیار کر کے آتے۔ وہ پورے کے پورے اقتباسات بالکل صحیح صحیح سنا سکتے تھے۔ ایک درسی کتاب میں نیلسن کی زندگی پر رابرٹ سوتھلے کی ایک نظم شامل تھی۔ اس میں بہت سی بحری اصطلاحیں دی گئی تھیں جن سے طالب علم بالکل نامانوس تھے۔ گوکھلے ہر ہفتے بمبئی بندرگاہ کی گودیوں میں جاتے اور جنگی جہازوں اور دوسرے جہازوں کے مختلف حصوں اور آلات کے بارے میں معلومات حاصل کرتے۔ انھوں نے یہ سبق اس شان سے پڑھایا جیسے وہ کوئی پیشہ ور جہاز راں ہوں۔ بچے ان کی بہت قدر اور ان سے بہت محبت کرتے تھے۔

اس زمانے میں ان کا ایک بڑا کارنامہ ریاضی کی ایک کتاب مرتب کرنا تھا۔ یہ کتاب انھوں نے اپنے ایک ساتھی این. جی. پنت کے تعاون سے تیار کی تھی۔ وہ ایک معیاری درسی کتاب بن گئی جس کا کئی ہندوستانی زبانوں میں ترجمہ کیا گیا۔

ایک استاد کی حیثیت سے گوکھلے کی کامیابی پر دو ماہرین تعلیم کی نظر پڑی۔ یہ تھے بال گنگا دھر تلک اور پروفیسر گوپال گنیش اگرکر۔ یہ چاہتے تھے کہ

گوکھلے دکن ایجوکیشن سوسائٹی میں شامل ہو جائیں۔ یہ سوسائٹی 1884 میں بمبئی ہائی کورٹ کے جج مہادیو گوبند راناڈے کی تحریک پر قائم ہوئی تھی۔ اس سوسائٹی کا مقصد سماج کے غریب طبقے کے لیے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھولنا تھا۔ اسی مقصد سے 1885 میں فرگوسن کالج قائم کیا گیا تھا۔ گوکھلے 1886 میں اس سوسائٹی کے مستقل ممبر بن گئے۔ انھیں فرگوسن کالج میں 75 روپے مہینہ پر پڑھانے کے لیے بلایا گیا۔

گوکھلے نے اپنی زندگی کے 20 سال تک اس کالج کی خدمت کرنے کا عہد لیا انھوں نے قانون کے اپنے ایک ساتھی طالب علم سے مذاق میں کہا تھا کہ" تم دولت کماؤ گے اور گاڑیوں میں گھومو گے جب کہ میں نے ایک غریب پیدل راہ گیر بننے کا فیصلہ کرلیا ہے۔" وہ ریاضی، انگریزی، اقتصادیات اور تاریخ اور انگلستان میں دستور کے ارتقا کی تاریخ پڑھانے لگے۔ ان سبھی مضامین میں انھیں ایک جیسی مہارت حاصل تھی۔ انھیں اکثر ہرفن مولا کہا جاتا تھا۔

عوامی زندگی

گوکھلے 20 سال کی عمر میں 1886 میں پہلی بار عوامی زندگی میں شریک ہوئے۔ انھوں نے کولھاپور میں اپنی پہلی تقریر کی جس کا عنوان تھا "انگریزی راج میں ہندوستان" ان کی خطابت کو بہت پسند کیا گیا۔

"دکن ایجوکیشن سوسائٹی" میں انھوں نے ذمہ داریاں اٹھانے کا سلیقہ سیکھا۔ وہ ایک انگریزی ہفتہ وار "مہارٹا" میں برابر مضامین لکھتے رہے۔ یہ اخبار وشنو کرشن چپلونکر نے شروع کیا تھا اور بعد میں تلک اور آگرکر نے اسے لے لیا تھا۔ ان لوگوں میں تعلیم کے ذریعے لوگوں میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرنے کا حوصلہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ گوکھلے پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ یہ بات ان کے دل میں بیٹھ گئی کہ تعلیم کے ذریعے قوم کو متحد کیا جاسکتا ہے۔

1888 میں آگرکر نے ایک انگریزی مراٹھی ہفتہ وار "سدھارک" جاری کیا۔ اس کا مقصد سماج سیوا کرنا تھا۔ گوکھلے بھی اس اخبار کے ساتھ جٹ گئے اور اس کے انگریزی حصے میں برابر مضامین لکھتے رہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ "سارو جنک سبھا" کے اعزازی سکریٹری اور اس کے سہ ماہی رسالے کے ایڈیٹر ہو گئے۔ 1870 میں راناڈے نے یہ سبھا قائم کی تھی۔ اس کا مقصد سرکار کے سامنے منظم شکل میں لوگوں کی شکایتیں اور مانگیں پیش کرنا تھا۔

دکن ایجوکیشن سوسائٹی سے 1890 میں تلک کے استعفیٰ دینے کے بعد گوکھلے کی ذمہ داریاں بڑھ گئیں۔ اگلے سال وہ سوسائٹی کے سکریٹری بنا دیے گئے۔

گوکھلے نے ان اداروں کی جو بے لوث خدمت کی اس کا اعتراف کیا جاتا تھا۔ 1893 میں انھیں بمبئی پروانشیل کانفرنس کا سربراہ مقرر کر دیا گیا۔ دو سال بعد وہ بمبئی یونیورسٹی کی سینیٹ کے ممبر چن لیے گئے۔

1896 میں راناڈے نے ایک نئی تنظیم "دکن سبھا" شروع کی۔ اس کا مقصد بھی دکن ایجوکیشن سوسائٹی اور سارو جنک سبھا جیسا ہی تھا۔ اس سوسائٹی کی طرف سے حکومت کو، انتظامی امور، طاعون سے چھٹکارا، لوکل سیلف گورنمنٹ، اصلاح آراضی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی پر عرض داشت پیش کر کے اصلاحی کارروائی کرنے کی مانگ کی گئی تھی۔ گوکھلے نے اپنے آرام کا سارا وقت ان کاموں میں لگا دیے۔

دن بہ دن ان کی ذمہ داریاں بڑھتی گئیں۔ 1898 سے 1906 تک وہ پونہ میونسپلٹی کے ممبر رہے۔ دوبارہ وہ اس کے صدر بھی رہے۔ لوگ اپنی شکایتیں لے کر بڑی آسانی سے ان تک پہنچ سکتے تھے۔ پانی کی سپلائی اور پانی کی نکاسی جیسے معاملوں کا مسئلہ وہ عملی قدم اٹھا کر سلجھایا کرتے تھے۔ اس حوصلہ مند سماج سدھارک گوکھلے نے پونہ سے اپنا ایک روزنامہ "گیان پرکاش" بھی جاری کیا۔ سیاسی اور سماجی اصلاح پر اپنے خیاالات کی تبلیغ واشاعت وہ اس کے ذریعے کرتے تھے۔

سرونٹس آف انڈیا

گوکھلے میں غریبوں کی زندگی کو اونچا اٹھانے کا جذبہ ہمیشہ سے کارفرما رہا تھا۔ 1905 میں انھوں نے "سرونٹس آف انڈیا" سوسائٹی قائم کی۔ یہ سوسائٹی ایسے حوصلہ مند اور بے لوث نوجوانوں کی تربیت کرتی تھی جو سماج سدھار کا کام کرنے کو تیار ہوں۔ ان میں زیادہ تر یونیورسٹیوں کے گریجویٹ ہوا کرتے تھے۔ انھیں اپنے زمانے کے مسئلوں سے آگاہ کیا جاتا تھا اور دستوری طریقے سے بدیسی حکومت کے خلاف لڑائی لڑنے کی تربیت دی جاتی تھی۔ ان تربیت پانے والوں کو داہ، پرخلوص اور ایک لگن کے ساتھ زندگی گزارنے کا عہد لینا پڑتا تھا۔

گوکھلے کی رہنمائی میں سوسائٹی کے ممبروں نے قبائلیوں (آدی واسیوں)، سیلاب اور قحط سے متاثر لوگوں کی مدد کرنے اور عورتوں کی تعلیم کے میدان میں نمایاں کام انجام دیے۔

گوکھلے کا اپنے کارکنوں پر جو اثر تھا اسے دیکھتے ہوئے اکثر لوگ کہتے تھے کہ" ہمیں ہلائے رکھنے کے لیے تو ایک ہی گوکھلے کافی ہے مگر جب ان جیسے بہت سے گوکھلے جو تیار ہو رہے ہیں، میدان میں ہوں گے تو ہمارا کیا حال ہوگا؟"

گوکھلے کی زندگی پر شروع میں ہی اس زمانے کی اہم شخصیات کا اثر پڑا جنھوں نے ان کی زندگی کو اس رنگ میں ڈھال دیا۔

دادا بھائی نوروجی ہندوستان کے اقتصادی مسائل سے بہت فکرمند تھے۔ ملک کے مالی وسائل کی نکاس سے یہ مسئلہ پیدا ہو رہا تھا۔ گوکھلے نے اس

موضوع کا گہرائی سے مطالعہ کرنے کی ٹھان لی۔ نوروجی کے کھلے دل اور دماغ کے رویے نے انھیں بہت متاثر کیا۔

ممتاز قانون داں اور جانے مانے رہنما فیروز شاہ مہتہ کی پر وقار زندگی میں انھیں خاص کشش نظر آئی۔

سرکردہ وکیل اور انگریزی حکومت کے نڈر نکتہ چینی کرنے والے سردنشا ایڈل جی واچا کی شخصیت ان کے لیے بڑے بھائی جیسی تھی جن سے انھیں اچھے مشورے اور رہنمائی ملتی رہتی تھی۔

پارلیمنٹ کے ممبر سر ولیم ویڈر برن نے انھیں لبرل خیالات سے روشناس کیا۔ ان کی ہی مدد سے گوکھلے انگلینڈ میں ہندوستان کے مسائل بے خوف ہو کر اٹھانے لگے۔

مگر گوکھلے کی زندگی پر سب سے گہری چھاپ مہادیو گووند راناڈے کی پڑی تھی جن کی رہنمائی میں انھوں نے 1887 میں کام شروع کیا تھا۔ انھوں نے 15 سال تک عوامی زندگی کے سبھی پہلوؤں کی انھیں تربیت دی۔ عوامی زندگی میں خلوص اور حوصلہ مندی برتنے کا سبق انھیں پڑھایا۔ 1901 میں راناڈے کا انتقال ہونے پر گوکھلے اپنے کو یتیم محسوس کرنے لگے۔ انھوں نے گوکھلے کو ایک رومال (اسکارف) دیا تھا، جسے وہ زندگی بھر کافی عزیز رکھتے تھے۔ گیارہ سال بعد جنوبی افریقہ کے سفر کے دوران گوکھلے کو جوہانسبرگ میں ایک دعوت میں شریک ہونا تھا۔ دعوت میں جانے کے لیے اس رومال پر استری کرنے کی ضرورت تھی، گاندھی جی نے اس میں مدد دینے کی پیشکش کی۔ گوکھلے نے اس پر گاندھی جی سے کہا کہ ''ایک وکیل کی حیثیت سے تو میں تم پر اعتبار کر سکتا ہوں مگر ایک دھوبی کی حیثیت سے نہیں۔ اگر تم نے اس رومال کو خراب کر دیا تو جانتے ہو کیا ہوگا۔ تمھیں نہیں معلوم ہے کہ مجھے یہ رومال کتنا عزیز ہے۔'' گاندھی جی بھی اپنی دھن کے پکے تھے، چنانچہ انھوں نے دکھا دیا کہ ایک دھوبی کی حیثیت میں بھی ان پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔

سیاسی گرو

گاندھی جی 1896 میں جنوبی افریقہ سے ہندوستان آئے تا کہ یہاں سے وہ جنوبی افریقہ میں شروع کی ہوئی نسلی امتیاز کے خلاف جنگ میں کچھ مدد حاصل کر سکیں۔ جب وہ گوکھلے سے ملے تو ان کے چہرے مہرے اور نیک سیرت سے بہت متاثر ہوئے۔ گاندھی جی نے اسی وقت انھیں اپنا سیاسی گرو تسلیم کر لیا۔ گوکھلے کی شخصیت انھیں ''گنگا'' جیسی لگی جو ہر کسی کو اپنی آغوش میں بلاتی ہے اور جس میں کشتی اور پتوار لے کر نکلنا کافی فرحت بخش ہوتا ہے۔

گاندھی جی کے سادہ طور طریقے اور ڈھکوسلوں سے پاک عادتوں سے گوکھلے بھی متاثر ہوئے اور ان کے ساتھ بڑے بھائی کی طرح بہت محبت اور مہربانی کا سلوک کرنے لگے۔

گاندھی جی نے گوکھلے سے سوراج حاصل کرنے کے لیے پر امن منظم اور قانونی طور طریقے اپنانے کے گر سیکھے۔ گوکھلے کے نزدیک سوراج کا مفہوم تھا ''برطانوی کامن ویلتھ کے اندر رہتے ہوئے ہندوستان کے لیے سیاسی برابری اور خود اپنی حکومت کا حق حاصل کرنا۔'' انھیں آزادی، حریت پسند اور حق پرست انگریز قوم کی دیانت داری پر پورا بھروسا تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ انگریز قوم میں بہتر سوچ رکھنے والوں کے تعاون سے ہندوستان اپنی منزل پا سکے گا۔

کانگریس میں

گوکھلے 1889 میں کانگریس میں شامل ہوئے۔ کانگریس کے پلیٹ فارم سے انھوں نے پرزور آواز اٹھائی۔ ان کا مقصد واضح اور ان کی باتیں دلائل سے بھری ہوئی تھیں۔ انھوں نے عوام کے اندرونی جذبات اور حوصلے کی بھرپور ترجمانی کی۔

1889 میں کانگریس کا اجلاس بمبئی میں ہوا تھا جس میں گوکھلے نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ انھوں نے حکومت کو اس بات کے لیے آڑے ہاتھوں لیا کہ وہ انڈین سول سروس کے امتحانات انگلینڈ کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں کرانے کا بندوبست کیوں نہیں کرتی۔ یہ اس سے پہلے کیے گئے وعدے کی سراسر خلاف ورزی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ کسی ہندوستانی کی ترقی کے راستے میں رنگ، نسل اور فرقے کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں برتی جائے گی۔ گوکھلے نے کہا کہ ''انگلینڈ نے یا تو دیانتداری سے یہ وعدہ نہیں کیا تھا یا اب اسے ہم سے کیے گئے وعدے کا پاس نہیں رہ گیا ہے۔'' گوکھلے کو بہت سی تجاویز پر بولنے کے لیے بلایا گیا۔

1905 میں گوکھلے کو لالہ لاجپت رائے کے ساتھ کانگریس کے نمائندے کی حیثیت سے انگلینڈ بھی جانا پڑا۔ انھیں انگریز سیاست دانوں اور انگریز عوام کے سامنے ہندوستان کے حالات کی صحیح تصویر پیش کرنا تھی۔ اپنے 49 دن کے قیام کے دوران گوکھلے نے مختلف شہروں میں 45 تقریریں کیں جن میں انھوں نے ہندوستان کا سچا نقشہ کھینچ کر رکھ دیا۔ ان کی جادو بیانی نے لوگوں کو بہت متاثر کیا۔ یقیناً گوکھلے ہندوستان کی آواز بن گئے۔

ویلبی کمیشن

دادا بھائی نوروجی اس بات پر زور دیتے رہے تھے کہ ہندوستان کی معاشی حالات کی جانچ کے لیے کوئی کمیشن مقرر کیا جائے۔ ملک کا انتظام چلانے، فوجی اور غیر فوجی اخراجات کے لیے جو ٹیکس وصول کیا جاتا ہے اس سے لوگوں کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ مئی 1896 میں لارڈ ویلبی کی سربراہی میں

ایک کمیشن مقرر کیا گیا، اس لیے اسے ''ویلبی کمیشن'' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ کمیشن نے 1897 میں انگلینڈ میں اپنا کام شروع کیا۔ ہندوستان کی تین پریسیڈنسی کلکتہ، بمبئی اور مدراس سے تین نمائندے سریندر ناتھ بنرجی، ڈی.ای. واچا اور جی.ایس. آیر بھیجے گئے۔ پونہ اس وقت دانشوروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ جس کی خاص سیاسی حیثیت بھی تھی۔ گوکھلے کو دکن سبھا کا نمائندہ نامزد کیا گیا۔

گوکھلے کا یہ انگلینڈ کا پہلا سفر تھا۔ انھوں نے کمیشن کے سامنے حقائق اور شواہد پیش کیے اور اپنے سے دوگنی عمر اور تجربہ رکھنے والے لوگوں کے تیکھے سوالوں کا سامنا کیا۔ جتنے بھی سوالات وہاں اٹھائے گئے گوکھلے نے سبھی کے مدلل جواب دیے۔ کہا جاتا ہے کہ کسی تعلیم یافتہ ہندوستانی معلم کی طرف سے اتنی واضح اور ماہرانہ طریقے سے بات اس سے پہلے کبھی نہیں رکھی گئی تھی۔

معاشی امور پر ان کی اتنی اچھی پکڑ نے سبھی کو حیرت میں ڈال دیا۔ برطانوی حکومت کے قائم ہونے کے بعد سے ہندوستان میں جو سیاسی اور سماجی زوال آیا تھا، گوکھلے نے اعداد و شمار پیش کر کے اپنی دلیلوں سے لوگوں کو قائل کر دیا۔ انھیں اس سے انکار نہیں تھا کہ ریلوے کی ترقی سے ہندوستان کو فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ یقیناً اس کی وجہ سے اب دور دراز کے علاقوں تک پہنچنا ممکن ہو گیا ہے مگر اسی کے ساتھ ریلوے نے مغربی ملکوں کی فیکٹریوں کا سستا مال ان علاقوں میں پہنچایا ہے اور ہندوستان کے سستے خام مال کی ڈھلائی کر کے جہاز کے ذریعے مغربی ملکوں کے کارخانوں کو پہنچایا بھی ہے۔ اس سے ہندوستان پر دوطرفہ مار پڑی ہے۔ اس سے ہندوستان کی گھریلو صنعتیں برباد ہوئی ہیں اور ہندوستانی دستکار بیکار ہوئے ہیں۔

گوکھلے کی اس کے لیے بہت تعریف کی گئی مگر انھوں نے بہت انکساری سے اس کا سہرا اپنے دو استادوں کے سر باندھ دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ سب کچھ راناڈے اور ان کے ایک ہیڈ ماسٹر جی.وی. جوشی کی دین ہے جنھوں نے انھیں تیار کیا تھا۔

معافی کا واقعہ

اسے ستم ظریفی ہی کہا جائے گا کہ ان کے اس کارنامے پر ایک واقعہ کا سیاہ سایہ بھی پڑا اسے معافی کا واقعہ کہتے ہیں۔

ویلبی کمیشن کے سلسلے میں جب گوکھلے 1897 میں انگلستان میں تھے تو بمبئی پریسیڈنسی میں طاعون کی وبا پھیل گئی۔ پونہ اس وبا سے سب سے زیادہ متاثر تھا۔ طاعون ریلیف کمیٹی میں کام کرنے والے برطانوی فوجیوں نے اپنے کام میں لوگوں کے مذہبی جذبات اور سماجی احساسات کا خیال نہیں رکھا۔ اس بیماری پر قابو پانے کے لیے انھوں نے سخت تدبیریں اختیار کیں۔ بیماری کے دفاع کے لیے بوڑھے مردوں عورتوں کے کپڑے پھاڑنے لگے۔ ان احتیاطی تدبیروں میں انھوں نے پوجا کی مورتیوں کو بھی سڑکوں پر پھینک دیا اور لوگوں کی ملکیتوں کو بھی بے دردی سے نقصان پہنچایا۔

لوگ اس سے بہت برہم ہوئے۔ لوگوں نے غصہ میں آکر طاعون ریلیف کمیٹی کے صدر مسٹر رانڈ اور لیفٹننٹ کرنل آیرسٹ کو قتل کر دیا۔ یہ دونوں پونے کے گورنمنٹ ہاؤس سے ملکہ وکٹوریہ کی ڈائمنڈ جوبلی تقریبات میں شرکت کر کے لوٹ رہے تھے۔

ہندوستان میں گوکھلے کے کچھ قابل اعتماد اور ذمہ دار دوست خط لکھ لکھ کر انھیں برابر صورت حال سے آگاہ رکھ رہے تھے۔ ''سدھارک''، ''کیسری'' اور ''مراٹھا'' میں بھی اس کی خبریں چھپ رہی تھیں۔

گوکھلے کو اس سے کافی تکلیف پہنچ رہی تھی۔ وہ متاثر لوگوں کی مدد کرنا چاہتے تھے۔ سر ویڈر برن کے ذریعے سے انھوں نے برطانوی پارلیمنٹ کے سرکردہ کچھ ممبروں سے ملاقات کی اور انھیں لوگوں پر ڈھائے جا رہے ظلم و ستم کی جانکاری دی۔ انھوں نے اس سلسلے میں مانچسٹر گارجین کے ایک نمائندے کو انٹرویو بھی دیا۔

بمبئی کے گورنر لارڈ سینڈ ہرسٹ نے بلا تاخیر انگلستان کی حکومت کو مطلع کیا کہ ظلم اور زیادتی کی ساری باتیں غلط ہیں اور بدخواہوں کی پھیلائی ہوئی ہیں۔

گوکھلے بہت مایوس ہو کر ہندوستان لوٹے۔ ان کے بہی خواہوں میں دادا بھائی نوروجی، سر ویڈر برن، اے.او. ہیوم، سریندر ناتھ بنرجی اور بہت سے دوسرے لوگ شامل تھے جو گوکھلے، کے خلوص اور سچائی کے قائل تھے۔ یہ سب بہی خواہ پوری طرح گوکھلے کے ساتھ رہے اور اس میں ہر طرح سے ان کی مدد کی۔ راناڈے اور فیروز شاہ مہتا نے گوکھلے کو صلاح دی کہ اس سے ذہنی چھٹکارا پانے کے لیے انھیں معافی مانگ لینی چاہیے۔ گوکھلے نے ایسا ہی کیا۔

1898 میں پھر طاعون پھیلنے پر انھوں نے نوجوان رضا کاروں کو ساتھ لے کر کام شروع کیا۔ اگلے سال انھوں نے طاعون ریلیف کمیٹی کا ممبر بنا لیا گیا۔

1899 میں گوکھلے دو سال کے لیے بمبئی Legislative کونسل کے ممبر منتخب ہو گئے۔ بمبئی لگاتار طاعون اور قحط سے متاثر رہا تھا۔ انھوں نے قحط سے نجات کے ضابطوں کی غیر تسلی بخش کارروائی کے خلاف آواز اٹھائی۔ ریلیف کا کام ٹھیک ڈھنگ سے نہیں چل رہا تھا۔ ان کی دلیل تھی کہ حکومت کو قحط زدہ علاقوں میں چھوٹی صنعتیں شروع کرنی چاہئیں۔

کسان دن بہ دن بڑھتے ہوئے قرضوں سے دبا ہوا تھا۔ قرض اس کا علاج نہیں تھا۔ یہ تو بیماری سے بھی بدتر تھا۔ ان کی تجویز تھی کہ کوآپریٹیو سوسائٹیاں قائم کر کے کسانوں کو قرض کے بوجھ سے نجات دلائی جائے۔

حکومت نے بہت بعد میں اس بات کو منظور کیا۔

فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کرنے میں بھی انھوں نے اہم رول ادا کیا۔ مختلف فرقوں کے علاحدہ حق ارادیت کی انھوں نے جم کر مخالفت کی۔ انھوں نے نشہ آور چیزوں کی خرید وفروخت پر پابندی لگانے کی حکومت سے مانگ کی جس سے حکومت کو آمدنی ہوتی ہے مگر برائیاں پھیلتی ہیں۔

1902 میں گوکھلے فرگوسن کالج سے سبکدوش ہو گئے۔ مگر ان کے لیے ابھی بہت سارا کام باقی تھا۔ وہ امپیریل لیجسلیٹو کونسل کے ممبر چن لیے گئے۔ یہ سیٹ فیروز شاہ مہتا کی رکنیت کی مدت پوری ہونے پر خالی ہوئی تھی۔ کونسل میں انھوں نے اپنے کام کا آغاز بجٹ پر بحث سے شروع کیا۔ بجٹ پر ان کی تقریر ایک تاریخی دستاویز بن گئی جس کی بہت تعریف ہوئی۔

وہ ہر مرحلے پر حکومت پر زور دیتے رہے کہ سرکاری ملازمتوں میں زیادہ سے زیادہ ہندوستانیوں کو رکھا جائے، فوجی خرچ کم کیا جائے، نمک ٹیکس معاف کیا جائے، آبپاشی کی سہولتیں بڑھائی جائیں، سائنسی اور زرعی تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ قحط ریلیف کے فنڈ کو معقول طریقے سے خرچ کیا جائے اور مقامی انتظام کے لیے جمہوری ادارے قائم کیے جائیں۔

1904 کے یونیورسٹی قانون کی انھوں نے بھرپور تنقید کی کیونکہ اس میں تعلیم کے میدان میں ہندوستانیوں کو شامل کرنے کی بجائے انھیں دور کیا جا رہا تھا۔ مفت ابتدائی تعلیم کو لازمی بنانے کے لیے 1911 میں انھوں نے ایک بل رکھا۔ یہ ایک بڑا کارنامہ تھا۔ افسرشاہی کی سردمہری کی وجہ سے یہ بل پاس نہیں ہو سکا۔

ان کا کہنا تھا کہ عوام اور حکومت کے درمیان بڑھتی ہوئی دوری کے لیے خود حکومت ذمہ دار ہے۔ ان کی دلیل تھی کہ 1907 کا ''باغیانہ میٹنگ قانون'' 1889 کا ''آفیشیل سیکریٹ قانون'' اور 1910 کا ''پریس بل'' ان سب کے ذریعے عوام کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ ایسے قانونوں کے پاس ہونے سے عوام اور حکومت کے بیچ دوری بڑھی ہے وہ ان سب کی مخالفت کرتے رہے۔

امپیریل لیجسلیٹو کونسل میں ان کی کارکردگی نہایت اعلیٰ درجے کی تھی۔ ہندوستان کے وائسرائے (1890-1905) لارڈ کرزن کا کہنا تھا کہ ''اتنے مضبوط ارادے کے کم آدمیوں سے وہ ملے ہیں۔ ان کے ساتھ دلیل اور بحث مباحثے کا اپنا الگ ہی مزہ ہے۔''

گوکھلے کو سب سے بڑا اعزاز 1905 میں اس وقت ملا جب وہ ہندوستان کے معاملوں کی وکالت کرنے انگلستان گئے ہوئے تھے۔ انھیں بنارس میں ہونے والے کانگریس کے اجلاس کا صدر چن لیا گیا تھا۔

لارڈ کرزن نے بنگال کی تقسیم کا منصوبہ پاس کر دیا تھا، جس کی کافی مخالفت ہوئی تھی۔ کانگریس کے گرم لیڈروں کا رویہ بھی بہت سخت ہو گیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس برطانوی سامان کے بائیکاٹ جیسی اہم تجویز پاس کرے۔

اس معاملے پر کانگریس بٹ گئی تھی۔ گوکھلے نے پہلے کی طرح خاموش حکمت عملی کا رویہ اختیار کیا۔ بنارس کا اجلاس باہمی مفاہمت کے ماحول میں بخیر وخوبی انجام پا گیا۔ کانگریس کو دستوری حکمت عملی کا پابند بنائے رکھنے میں گوکھلے کامیاب رہے۔

نرم اور گرم دل

شدت پسند طبقہ یا گرم دل سودیشی کے معاملے میں کانگریس کے رویے اور آزادی حاصل کرنے کے طور طریقوں سے غیر مطمئن رہا۔ 1906 میں کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں دادا بھائی نوروجی کی صدارت میں ہوا۔ اس اجلاس میں ''سوراج'' یا ''خود اختیاری حکومت'' کو ہندوستان کا نصب العین قرار دیا گیا۔

گوکھلے کی رہنمائی میں کانگریس کے نرم دل نے سوراج کو نصب العین تو مان لیا مگر یہ سوراج دستوری طریقے اپنا کر ہی حاصل کیا جا سکتا ہے۔ انھوں نے انتہا پسندی کی بجائے بتدریج اصلاح پر زور دیا۔ 1907 میں کانگریس کا اجلاس سورت میں ہوا۔ جس میں صدر کے معاملے کو لے کر اختلافات ابھرے۔ گوکھلے کی رہنمائی میں نرم دل والوں کو غلبہ حاصل تھا اور ان کے نمائندے ڈاکٹر راس بہاری گھوش کا نام سامنے آیا۔ ڈاکٹر گھوش عوام میں مقبول تھے۔ وہ بنگال میں قومی تعلیمی اداروں کے قیام کے لیے کافی دولت دے چکے تھے۔ گرم دل والوں کو اس پر اتفاق نہیں تھا۔ اجلاس کے دن کافی اشتعال پھیل گیا اور اجلاس میں افراتفری مچ گئی۔ دونوں نے اس دن اپنی الگ الگ بیٹھک کی۔ گوکھلے کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ 1907 میں ان کے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد ان پر خاندان کی ذمہ داریاں بھی بڑھ گئی تھیں۔

مگر گوکھلے تن تنہا کانگریس کو پھر سے صحت مند بنانے کے کام میں جٹے رہے۔ انھوں نے کانگریس کے لیے ایک نئے دستور کا مسودہ تیار کیا۔ انتہا پسند یا گرم دل کے لیڈروں کی رضامندی سے انتخاب کا ایک نیا طریقہ کار وضع کیا گیا۔ مگر دونوں کے درمیان کوئی صلح مشکل ہو گئی۔ انتہا پسندوں کے پاس کوئی رہنما نہیں رہ گیا تھا۔ تلک جیل میں تھے اور 1908 میں انھیں ملک بدر کر کے برما بھیج دیا گیا تھا۔ لالہ لاجپت رائے نے امریکہ میں پناہ لے لی تھی۔ بپن چندر پال کو چھ مہینے جیل کی سزا ہو گئی تھی۔ جس کے بعد کچھ سال کے لیے وہ لندن میں مقیم ہو گئے تھے۔ اربندو گھوش پانڈیچیری میں دن گزار رہے تھے۔ سورت میں پارٹی کے دو ٹکڑے ہو جانے کے بعد کانگریس پر تو نرم دل والوں کا غلبہ ہو گیا، مگر عوام میں ان کی مقبولیت گھٹ گئی۔ یہیں سے ہندوستان کی

سیاست میں نرم پنتھی سیاست کا خاتمہ ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

اصلاحات

گوکھلے نے دستوری سدھار کی سمت میں نمایاں کارنامہ انجام دیا۔ یہ اصلاحات 1909 کی "منٹو۔ مارلے اصلاحات" کے نام سے مشہور ہیں۔ اس وقت کے گورنر لارڈ منٹو اور ہندوستانی معاملوں کے برطانوی وزیر لارڈ مارلے کے نام سے یہ اصلاحات مشہور ہوئیں۔

1909 میں ان اصلاحات کو قانونی شکل مل گئی۔ یہ اصلاحات بہت مایوس کن تھیں۔ ان میں لوگوں کو سچا جمہوری نظام نہیں دیا گیا تھا۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کا گوکھلے کا سپنا بھی اس سے چور چور ہو گیا۔ انھیں اس بات سے بہت مایوسی ہوئی کہ انتخابات میں مسلمانوں کو جداگانہ حیثیت دی گئی تھی۔ مگر اصلاحات کے لیے گوکھلے نے برسوں جو جدوجہد کی تھی اس کا کچھ نہ کچھ صلہ ضرور مل گیا تھا۔ ہندوستان والوں کو حکمرانی کی اعلیٰ سطح پر کچھ حصہ داری مل گئی تھی۔ عوامی امور کے معاملات کے فیصلوں میں اب باصلاحیت ہندوستانیوں کو اپنی بات رکھنے کا کچھ موقع دیا گیا تھا۔ گورنر جنرل کی ایکزیکیٹو کونسل میں ایک سیٹ ہندوستانیوں کے لیے مخصوص کر دی گئی تھی۔ شری ایس پی سنہا (جو بعد میں رائے پور کے لارڈ سنہا کی حیثیت سے مشہور ہوئے) یہ اعزاز حاصل کرنے والے پہلے ہندوستانی تھے۔ ہندوستانی نمائندے کو عوامی مفاد کے معاملات میں تجویز پیش کرنے کا اختیار بھی دیا گیا تھا۔

خود اختیاری حکومت کی طرف یہ پہلا قدم تھا۔

جنوبی افریقہ میں

گوکھلے کو جنوبی افریقہ میں رہنے والے ہندوستانیوں سے کافی ہمدردی تھی۔ وہاں ہندوستانیوں پر جو ظلم ڈھایا جا رہا تھا اسے وہ اپنے خلاف ظلم تصور کرتے تھے۔

گاندھی جی کے بلاوے پر وہ 1912 میں جنوبی افریقہ گئے۔ یہ پہلا موقع تھا جب کوئی ہندوستانی لیڈر ہندوستان کے باہر ایسے ملک میں گیا تھا جہاں ہندوستانی لوگ ہجرت کر کے گئے تھے۔ ان کا مقصد ہندوستان کے لوگوں کی حالت کا جائزہ لینا تھا۔

گوکھلے نومبر 1912 میں ہندوستان واپس آ گئے۔ جنوبی افریقہ کی حکومت نے جلدی وہ وعدے بھلا دیے۔ جو اس نے گوکھلے سے کیے تھے۔ وہاں نسلی امتیاز اپنی ساری دہشت گردی کے ساتھ جاری رہا۔

گاندھی جی اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر نسلی امتیاز کے خلاف جدوجہد میں لگے ہوئے تھے۔

گوکھلے گاندھی جی کی حوصلہ مندانہ کارروائی سے بہت متاثر تھے اور انھوں نے مختلف ذرائع سے رقم جمع کر کے ان کی مدد بھی کی۔

1914 میں وائسرائے لارڈ ہارڈنگ نے گوکھلے کے نمایاں کارناموں کے لیے نائٹ کمانڈر کا خطاب دلانے کی تجویز رکھی جسے گوکھلے نے بہت نرمی سے نامنظور کر دیا۔

1912 میں حکومت نے ایک شاہی کمیشن مقرر کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ہندوستان میں سول سروس کی جانچ کے لیے مقرر کیے گئے اس کمیشن میں آٹھ یورپی اور تین ہندوستانی ممبر تھے۔ گوکھلے بھی ان میں شامل تھے۔ اس کمیشن نے اپنا کام دسمبر 1912 سے شروع کیا اور ہندوستان کے سارے بڑے شہروں میں گواہیاں لینے گیا۔ پھر 1913 میں انگلینڈ گیا۔ گوکھلے اس سلسلے میں وہاں چار مہینے رہے۔

انھوں نے بہت صبر و سکون اور ماہرانہ چابکدستی سے گواہوں کے ساتھ جرح کر کے ان کی جھوٹی شان اور تعصبات کا پردہ فاش کیا۔ انھوں نے سول سروس میں کم سے کم 35 سے 40 فیصد تک ہندوستانیوں کو نمائندگی دینے کی مانگ کی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ امپیریل اور صوبہ جاتی سروسیز میں ہندوستانیوں کو زیادہ سے زیادہ نمائندگی ملنی چاہیے۔

مگر کمیشن کی رپورٹ آنے تک گوکھلے زندہ نہیں رہے۔ کمیشن کی رپورٹ اگست 1915 میں ملی۔ برسہا برس کی انتھک محنت سے ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔

موت

تکان کی وجہ سے ان کی شکر کی بیماری (ذیابیطس) زور پکڑ گئی۔ سانس پھولنے اور دمے کی شکایت رہنے لگی۔ موت سے دو دن پہلے انھوں نے دستوری اصلاح کی اسکیم کے مسودے کو آخری شکل دی تھی۔ بمبئی گورنر لارڈ ولنگڈن کی فرمائش پر یہ اسکیم تیار کی گئی تھی۔ اس مسودے میں ہندوستانیوں کو بہت سی مختلف مراعات دینے کی بات کہی گئی تھی اس طرح کی باتیں 1919 کی مانٹیگو، چیمسفورڈ اصلاحات میں بھی سامنے آئیں۔

19 فروری 1915 کو رات ساڑھے دس بجے انھوں نے ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔ انھوں نے آسمان کی طرف انگلی اٹھائی اور پھر ہاتھوں کو جوڑ لیا۔ اس عظیم رہنما کا یہی آخری لمحہ تھا۔

□□□

گذشتہ دنوں اعظم ایجوکیشن ٹرسٹ، پونہ کی جانب سے رسالہ ''اسباق'' کے سلور جبلی نمبر کے اجرا کے سلسلے میں ایک جلسہ منعقد ہوا۔ اس موقعے پر لی گئی ایک تصویر میں بائیں سے
جناب قاضی مشتاق احمد، جناب محبوب راہی، جناب ممتاز پیر بھائی، جناب شمس الرحمن فاروقی، جناب مظفر حنفی، جناب منور پیر بھائی، جناب نذیر فتح پوری، جناب قاسم امام اور محترمہ عابدہ انعامدار۔

مدارس کے طلبہ کو بول چال کی عربی سے روشناس کرانے کے لیے قومی اردو کونسل نے دوسالہ ڈپلوما ان فنکشنل عربی کورس شروع کیا ہے جس کے 126 اسٹڈی سینٹر ملک کی 14 ریاستوں میں کھولے گئے ہیں۔
گذشتہ دنوں اس کورس کے طلبہ کا فائنل امتحان منعقد کیا گیا جس میں 4224 طلبہ شریک ہوئے۔ نثار ہائر سیکنڈری ایجوکیشن، کوپا گنج، مئو (اتر پردیش) کے اسٹڈی سینٹر پر امتحان دیتے طلبہ۔

RNI No. 70323/[illegible]
DL-SW-15/4104/20[illegible]
Date of Publication : 24/07/2006

URDU DUNIYA Monthly, August 2006, Vol. 8, Issue: 8
National Council for Promotion of Urdu Language
Department of Secondary & Higher Education, Ministry of H.R.D., Government of India

قومی اردو کونسل کی اہم مطبوعات

[illegible]

مصنف: ڈی.ڈی.کوشمبی

مترجم: بالمکند عرش ملسیانی

ہندوستان کی تہذیب وثقافت دنیا کی چند قدیم تہذیبوں اور ثقافتوں میں سے ایک ہے۔ مشہور مورخ ڈی.ڈی.کوسمبی نے اس کتاب میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کے سرچشموں کی نشاندہی کے علاوہ اس کی بالیدگی وترقی کا تحقیقی جائزہ پیش کیا ہے۔ ماقبل تاریخ عہد کی ثقافت، آریوں کی آمد اور مگدھ سلطنت کو خصوصیت سے موضوع بحث بنایا گیا ہے۔

صفحات: 319، قیمت -/73 روپے

شیر شاہ اور اس کا عہد

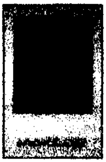

مصنف: کالکارنجن قانون گو

مترجم: رام آشرے شرما

شیر شاہ دنیا کی ان بڑی ہستیوں میں سے ایک ہے جن کے ساتھ تاریخ نے انصاف نہیں کیا ہے۔ اس کی سب سے اہم وجہ غالباً یہ تھی کہ شیر شاہ کی وفات کے دس سال کے اندر اس کا خاندان نیست ونابود ہو گیا اور زمام اقتدار پھر مغلوں کے ہاتھ میں آ گئی جنہیں شیر شاہ سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ اس کتاب میں فارسی زبان کے جملہ دستیاب نسخوں اور دیگر ذرائع کی مدد سے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے

صفحات: 704، قیمت -/135 روپے

تاریخ جہانگیر

مصنف: ڈاکٹر بینی پرشاد

مترجم: رحم علی الہاشمی

مغلیہ سلطنت کے چوتھے فرماں روا جہانگیر کے بارے میں لکھی گئی زیادہ تر کتابوں میں مغربی مورخین کی آرا سے استفادہ کیا گیا ہے جن کی صحت پر شک کی کافی گنجائشیں ہیں۔ اس کتاب میں پہلی مرتبہ تزک جہانگیری، اقبال نامہ اور دیگر فارسی تاریخوں، معاصر یوروپیوں کے سفرناموں اور خطوط کی مدد سے جہانگیر کے عہد حکومت کے تمام اہم سیاسی اور فوجی کارناموں کا احاطہ کیا گیا ہے۔

صفحات: 365، قیمت -/90 روپے

تاریخ شاہجہاں

مصنف: ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکینہ

مترجم: ڈاکٹر سید اعجاز حسین

شاہجہاں کا عہد حکومت ہندوستانی تاریخ کا ایک زریں باب سمجھا جاتا ہے۔ اس عہد میں ہر طرف امن چین اور خوش حالی تھی اور ہر طرف علم و ہنر کی ترقی نظر آتی تھی۔ اسی عہد میں تاج محل، لال قلعہ اور جامع مسجد جیسے ہند مغل فن تعمیر کے بہترین نمونے بھی وجود میں آئے اور بڑے بڑے جنگی معرکے بھی سر ہوئے لیکن اسی عہد میں عظیم مغلیہ سلطنت کے زوال کے آثار بھی نمودار ہونا شروع ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر بنارسی پرشاد سکینہ نے ان تمام حقائق کا معروضی جائزہ پیش کیا ہے۔

صفحات: 466، قیمت -/109 روپے

جنوبی ہند کی تاریخ

مصنف: کے.اے.نیل کنٹھ شاستری

مترجم: آر.کے.بھٹناگر

اس کتاب میں جنوبی ہندوستان کی قدیم تاریخ سے سترھویں صدی کے نصف تک کی مدت کا جائزہ پیش کیا گیا ہے جس میں جنوبی ہند کے جغرافیائی حالات، آریوں کا عروج، موریہ سلطنت، ستواہن، بہمنی اور دوسری سلطنتیں اور اس کا ادب، آرٹ، مذہب اور فلسفہ وغیرہ زیر بحث آئے ہیں۔

صفحات: 576، قیمت -/114 روپے

[illegible] وردی اور اس کا عہد

مصنف: کالی کنکر دتا

مترجم: عبدالاحد خاں خلیل

جب مغلیہ سلطنت کی بنیادیں کمزور ہو گئیں تو ملک کے مختلف خطوں میں خودمختار حکومتیں وجود میں آنے لگیں۔ بنگال میں علی وردی خاں نے 1740 میں اپنی حکومت قائم کی۔ اس کتاب میں علی وردی کے حالات زندگی، بنگال، بہار اور اڑیسہ پر اس کا قبضہ، مرہٹوں کے حملے، افغانوں کی بغاوت اور دیگر اہم واقعات کے ساتھ ساتھ اس عہد کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال پر بنیادی ماخذ کی مدد سے روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 392، قیمت -/86 روپے

انقلاب 1857

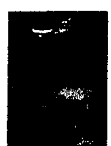

مرتب: پی.سی.جوشی

انقلاب 1857 ہندوستانی تاریخ کا ایک ایسا غیر معمولی واقعہ ہے جس کے ملک اور قوم پر دوررس اثرات مرتسم ہوئے۔ یہ انگریزوں کی غلامی سے نجات پانے کے لیے پہلی قومی بغاوت تھی جس نے ملکی سطح پر یکجہتی کے جذبات کو ابھارا۔ اس کتاب میں مختلف شعبۂ حیات پر اس کے اثرات پر ہندوستانی مورخین اور ادیبوں کے علاوہ غیر ملکی قلم کاروں کے بھی چند مقالات شامل کیے گئے ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ اس انقلاب کا بین الاقوامی سطح پر بھی غیر معمولی نوٹس لیا گیا۔

صفحات: 359، قیمت -/75 روپے

انقلاب فرانس

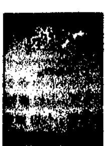

مصنف: جے.ایم.تھامسن

مترجم: بی.جے.سنگھ

1789 کا انقلاب فرانس تاریخ عالم کا ایک ناقابل فراموش واقعہ ہے جس نے تاریخ کے دھارے کا رخ موڑ دیا۔ آنے والے دنوں میں اس نے دنیا کی دیگر اقوام کو ظلم اور استحصال کے خلاف آواز بلند کرنے اور ظالم حکومتوں کا تختہ پلٹ دینے کا عزم وحوصلہ عطا کیا۔ اس کتاب میں اس عظیم انقلاب اور اس کے اثرات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔

صفحات: 758، قیمت: -/140 روپے

نوٹ:- طلبہ کے لیے 45 فیصد اور اساتذہ کے لیے 40 فیصد کی خصوصی رعایت۔ تاجرانِ کتب کو حسب ضوابط کمیشن دیا جائے گا.

Printed and Published by Dr. R.K. Bhat, Principal Publication Officer, NCPUL on behalf of NCPUL and printed at S. Narayan & Sons, B-88, Okhla Indl. Area, Phase-II, New Delhi-110020 and published at NCPUL, West Block-1, Wing-6, R.K. Puram, New Delhi-110066, Editor : Dr. R.K. Bhat, Tel : 26103381, 26103938